pq 43(3)

Biographies, italian —

غلامانِ اسلام

18

تالیف

مولانا سعید احمد ایم، اے

ندوۃ المصنفین دھلی

سلسلۂ ندوۃ المصنفین

(۷)

غلامانِ اسلام

جس میں اُن مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کیے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں

تالیف

مولانا سعید احمد ام-اے فاضل دیوبند

مینجر ندوۃ المصنفین کے اہتمام سے

ہمدرد پریس دہلی میں طبع ہوئی

سنہ ۱۳۶۷ھ

۱۹۴۸ء

(طبع ثانی)

غیر مجلد — ۵ صہ/ ۸/

مجلد — ۶ ے/ ۸/

فہرست مضامین

اِنتساب

اُن مقدس، پاکیزہ روحوں کے نام جن میں سے
ہر ایک زبانِ حال سے پُکار پُکار کہہ رہی ہے

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرّہ آفتابِ تابانیم

ندوۃ المصنفین دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

طبع دوئم

۱۹۴۰ء میں "غلامانِ اسلام" کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا تو اُسے دیکھ کر ندوۃ المصنفین کے ایک ممتاز فاضل معاون نے بڑے ہی اخلاص سے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔

"اگر آپ کے ادارے سے اس کتاب کے علاوہ دوسری کوئی کتاب شائع نہ ہوتی تب بھی واقعہ یہ ہے ادارے کے قیام کا مقصد پورا ہو جاتا اور سمجھنا چاہیے کہ اس میں لگایا ہوا سرمایہ مع نفع کے وصول ہو گیا"۔

یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہی، ۱۹۴۳ء آیا تو کتاب کا یہ ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ اسی وقت سے برابر یہ کوشش رہی کہ اس مہتم بالشان کتاب کا دوسرا ایڈیشن جلد سے جلد شائقین تک پہنچ جائے لیکن یہ وہ وقت تھا کہ جنگ کی ہولناکیاں زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو چکی تھیں اور کاغذ اور دیگر سامانِ طباعت کی کم یابی کی وجہ سے جدید مطبوعات کے ساتھ کسی طبع شدہ ضخیم کتاب کا نیا ایڈیشن نکالنا ممکن نہیں رہا تھا۔

بالآخر ۱۹۴۶ء میں اس کی کتابت شروع کرائی گئی، خیال تھا حالات جلد اعتدال پر آجائینگے اور رُکے ہوئے کاموں کے بکھرے ہوئے سِرے جُڑنے شروع ہو جائینگے، لیکن ملک میں یکایک ایک دوسری ہی صورت رُونما ہوگئی، دہلی کے آسمان کا رنگ بدل گیا، ندوۃ المصنفین برباد ہوا، اس کے نظامِ کار کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس کا لاکھوں کا ذخیرہ خاکستر

کردیا گیا، اس کے ہرے بھرے اور سجے سجائے دفتر کا ہزاروں کا سامان لوٹ لیا گیا اور اس کے ذمہ دار کارکن زندگی کے تمام ضروری سروسامان سے محروم ہوکر خانہ ویران ہو گئے، مہینوں کی جدوجہد کے بعد دہلی کے اسی کھولتے ہوئے پانی میں اللہ کے نام پر پھر کشتی ڈال دی گئی اور اب کاموں کے پراگندہ شیرازے کو ازسرنو جمانے کی فکر کی جارہی ہے۔

"غلامانِ اسلام" کا یہ جدید ایڈیشن اِن شاء اللہ تعالیٰ ادارے کے مستقبل کے لیے فالِ نیک ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بابرکت کتاب کے شائع ہوتے ہی راستے کی بہت سی مشکلیں دور ہو جائینگی،

ضرورت تھی کہ طبع اوّل پر فرصت میں نظر ثانی کی جاتی، لیکن فاضل مؤلف کو ارادے کے باوجود اس کا موقع نہیں ملا۔ اب کچھ ناموں کے اضافوں، ترتیب کے ضروری ردو بدل اور کتابت کی بعض مناسب ترمیموں کے بعد یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے اور انتہائی گرانی کے باوجود قیمت وہی رکھی گئی ہے جو پہلے تھی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی
ناظم ندوۃ المصنفین
یکم شعبان المعظم ۶۷ھ مطابق ۱۰ جون ۴۸ء

مقدمہ

اِس کتاب کے پہلے حصہ میں جو "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو کس مصلحت سے یک قلم ممنوع قرار نہیں دیا اور اس نے اس رواج کو باقی رکھا بھی تو کن اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ۔ جس کی وجہ سے غلامی غلامی نہیں بلکہ برادری بن گئی۔ اب اس دوسرے حصہ میں تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات پر کس طرح عمل کیا، غلاموں سے متعلق اُن کی ذہنیتوں میں اسلام نے کیسا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس انقلاب سے مسلمانوں کی اجتماعی و تمدنی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی۔ قبل اس کے کہ آپ اصل کتاب کا مطالعہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ میں اختصار کے ساتھ اُن عظیم الشان نتائج و اثرات کا تذکرہ کر دیا جائے جو غلامی اور غلاموں سے متعلق اسلام کی روشن تعلیمات اور اس کے بلند نقطۂ نظر پر مرتب ہوئے اور جن کا ثبوت آپ کو اصل کتاب کے ہر صفحہ میں ملیگا۔

اسلام میں غلامی کا تصور اسلام سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں تک نے غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک مستقل صنف قرار دے کر عام انسانوں کو آزاد اور غلام کی دو قسموں پر تقسیم کر رکھا تھا

اور پھر جتنے تمدنی اور معاشرتی حقوق تھے وہ سب آزاد لوگوں کے لیے مخصوص تھے غلام اُن سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے تھے ان قوموں کی اس ذہنیت کا اثر یہ ہوا کہ غلام کو سوسائٹی کی نگاہ میں ذلیل سمجھا جاتا تھا، سوشل زندگی میں اُس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ پھر اُس کی بیوی بچے اور اولاد اُن سب کے ساتھ اسی نفرت و حقارت کا معاملہ ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے غلامی کو اس زمانہ کے آئینِ جنگ کے مطابق محض ایک قسم کی سزا قرار دیا جس کا تعلق اس شخص کی ذات سے دائمی نہیں بلکہ محض عارضی اور زوال پذیر ہوتا ہے۔ اسلام میں جس طرح ذات پات کی اور ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ کی طبقاتی تقسیم قطعاً ایک بے معنی چیز ہے اسی طرح اسلامی نقطۂ نظر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانی سوسائٹی کو آزاد اور غلاموں کے دو طبقوں پر تقسیم کیا جائے۔ اور پھر دونوں کے مدنی اور شہری حقوق کی الگ الگ تشخیص و تعیین کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک غلامی کی حیثیت سزا کی سی ہے، آزاد و غلام میں فرق و امتیاز ہے لیکن سوشل معاملات، تمدنی حقوق اور انسانی مقتضیات کے اعتبار سے آقا اور غلام دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مصر کے نامور فاضل اور مصنّف ڈاکٹر حسن ابراہیم نے بالکل صحیح لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

> "اسلام نے غلاموں کی حالت کو سُدھارا اور آزادی کی راہیں ان کی دستگیری کی اسلام نے کھانے پینے، لباس اور تعلیم و تہذیب اور دوسرے بڑے بڑے مدنی اور شہری حقوق (civil rights) میں آقا اور غلام دونوں کو برابر کے درجہ میں رکھا ہے۔"[۲]

آزاد کردہ غلام کی حیثیت | یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلام جب تک غلام رہتا ہے اس کے لیے بحیثیت سزا یافتہ ہونے کے کچھ ایسی پابندیاں ضرور ہیں جن سے اُس کے انسانی شرف و عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن آزاد ہونے کے بعد تو — جس کے لیے اسلام نے متعدد اختیاری اور اضطراری طریقے تجویز کیے ہیں اور فکِ رقبہ کو سب سے بڑا ثواب

---

[۱] اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھو "اسلام میں غلامی کی حقیقت" [۲] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۱۴۱

کا کام قرار دے کر اس کی طرف مسلمانوں کو شدید رغبت دلائی ہے۔ غلام اور آزاد میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا

امام نووی اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اِنَّ الحکمَ السیدِ علیہ و مِلکہٗ	غلام پر اُس کے آقا کا حکم اور اُس کی ملکیت
لَہٗ کحبلٍ فی رقبۃ العبد و	غلام کی گردن میں ایک رسّی اور اُس طوق کی
کالغل المانع لہٗ من الخروج	طرح ہے جو اس کو نکلنے سے منع کرے، لیکن جب
فاذا اعتق فکانّہٗ اُطلِقت	وہ آزاد ہو جاتا ہے تو گویا اُس کی گردن رسّی یا
رقبتہٗ من ذٰلک[1]	طوق سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔

ولاء کا تعلق | بلکہ آزاد ہونے کے بعد غلام اور آقا میں ایسا تعلق اور رابطہ قائم ہو جاتا ہے کہ غلام اپنے آقا کے خاندانی یا قبائلی شرف و مجد میں برابر کا شریک سمجھا جاتا ہے، شریعتِ اسلام کی اصطلاح میں اس تعلق کو ولاء کہتے ہیں اور اس کو "الولاء لُحمۃ کلُحمۃِ النسب" فرما کر اتنا مضبوط اور ناقابل انفکاک قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح وہ شخص جو اپنے باپ کے علاوہ اپنے آپ کو کسی اور شخص کا بیٹا بتاتا ہو عند الشرع ملعون ہے اسی طرح جو غلام کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اس پر بھی لعنت بھیجی گئی ہے[2]۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "مولی القوم مِنھم" (کسی قوم کا مولیٰ اُسی کا ایک فرد ہوتا ہے) علامہ ابن خلدون اس کی توضیح اس طرح کرتے ہیں۔

> اہل عصبیت جب غیر نسب لوگوں کے ساتھ کوئی محالفت کرتے ہیں، یا ان کو غلام بناتے ہیں اور یہ لوگ ان کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں تو یہ بھی عصبیت میں اہلِ قبیلہ کے شریک بنجاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے "مولی القوم مِنھم"۔ یہ مولیٰ عام ہے، خواہ مولیٰ رِق ہو یا مولیٰ محالفت"

[1] شرح صحیح مسلم ج، ص ۱۳۵ [2] صحیح مسلم کتاب العتق

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

تمام بڑی بڑی حکومتوں کے آزاد کردہ غلاموں کا حال یہی تھا، یہ حکومت کے ولار میں حصہ دار ہونے کے باعث نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے چنانچہ حکومت بنو عباس میں ترک موالی، بنو برمک اور بنو نوبخت اس دعوے کے شاہد عدل ہیں - ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہارون رشید کے ولار کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے جعفر بن یحییٰ بن خالد کس قدر معظم و محترم سمجھا جاتا تھا[1]"

آزاد کردہ غلام کے مدنی حقوق | آزاد ہونے کے بعد اب وہ تمام کام کر سکتا ہے جو ایک حُرّ الاصل انسان کے لئے جائز ہیں، وہ لشکروں کی قیادت کر سکتا ہے، چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، اور اپنے اندرونی و بیرونی معاملات میں تصرف و اختیار کا پورا مجاز ہے۔

قیادت لشکر | حضرت اُسامہ بن زید بن حارثہؓ غلام زادہ تھے - اور کمسن بھی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس لشکر کی قیادت کے لئے منتخب فرمایا جس میں حضرت عمرؓ ایسے اکابر صحابہ شامل تھے - یہ لشکر مقام خندق تک پہنچا تھا کہ سید کونینؐ کا وصال ہو گیا - اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے بعض حضرات کی چہ میگوئیوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ہی باقی رکھا، اور اب آپ نے اس لشکر کو روانہ کیا تو اس شان سے کہ حضرت اُسامہ گھوڑے پر سوار تھے - اور خود خلیفۂ اسلام اُن کی مشایعت کے لئے پا پیادہ چل رہا تھا - اُسامہ بولے "آپ کو خدا کی قسم یا تو آپ بھی سوار ہو جائیے، ورنہ پھر میں بھی اُترا جاتا ہوں" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "نہیں نہیں خدا کی قسم! تم ہرگز نیچے نہ اُترو اور میں بھی سوار نہیں ہوں گا[2]"

امامت | آج کل نمازیں امامت ہر کہ ومہ کر لیتا ہے، لیکن عہد صحابہ میں اس منصب رفیع کی یہ زبوں حالت نہیں تھی - اُس زمانہ میں وہی حضرات امامت کر سکتے تھے جو علم و

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۶ - [2] تاریخ ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۱۲

فضل اور تقویٰ وطہارت میں نمایاں شخصیت رکھتے تھے اور مسلمانوں میں جنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام کو غلامی کے رواج پر بدنام کرنے والوں کو تعجب ہو گا کہ اس عہد میں احرار کی طرح غلام بھی امامت کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ حضرت سالم موالے حُذیفہ جن کی امامت کا واقعہ حدیث کی متعدد صحیح کتابوں میں مذکور ہے، وہ تو خیر آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے علاوہ متعدد واقعات ایسے بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غلام غلامی کی حالت میں امامت کرتے تھے۔ مثلاً ابوسفیان جو عبداللہ بن احمد کے غلام تھے آزاد ہونے سے پہلے بھی نماز پڑھاتے تھے اور اکابرِ صحابہ اِن کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، چنانچہ داؤد بن الحصین کے الفاظ یہ ہیں:۔

اِنّ اباسفیان کان یؤمّ بنی عبد الاشهل فی مسجدهم وهو مکاتب فی رمضان وفیهم قوم قد شهدوا بدرًا والعقبة۔ یہ واقعہ تو اُن کے مکاتب ہونے کے زمانہ کا ہے، لیکن ایک مرتبہ جب کہ یہ مکاتب بھی نہیں بلکہ رقیق محض تھے نماز پڑھا رہے تھے کہ محمد بن مسلمہ اور سلمہ بن سلامۃ جو مشہور صحابی ہیں ادھر سے گذرے تو ابوسفیان کی قرأت سننے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور پھر فرمایا:۔

مابهذا من امام باس[1] ایسے امام میں تو مضائقہ نہیں ہے

اسی طرح ذکوان بھی جو حضرت عائشہ کے غلام تھے اور جن کو انہوں نے مُدبّر کر دیا تھا قریش کی امامت کرتے تھے عبداللہ بن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ مقام حراء اور ثبیر کے درمیان قیام پذیر تھیں، ان سے شرفِ نیاز حاصل کرنے قریش کے بڑے بڑے وفد آتے تھے، اسی اثناء میں نماز کا وقت ہو جاتا تھا تو حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر امامت کرتے تھے، اور اگر وہ موجود نہ ہوتے تو ذکوان (فتاہا) اس فرض کو انجام دیتے تھے[2]

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۲۶ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۸۔

شادی

آج کل سادات اور شیوخ غیر ذات کے لوگوں سے خواہ وہ کیسے ہی حُرّ الاصل ہوں ازدواجی تعلق قائم کرنا اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں، لیکن عہدِ صحابہ و تابعین میں غلاموں سے متعلق اسلام کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کا اثر یہ تھا کہ نہایت نجیب الطرفین حضرات بھی باندیوں اور غلاموں سے شادی کرنے کو ذرا بھی معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ امام زین العابدینؒ جو خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ تھے اُن سے بڑھ کر نجیب و شریف کون ہوگا، سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کی والدۂ محترمہ (شہر بانو) بیوہ ہوگئیں تو امام زین العابدین نے اُن کا نکاح امام حسینؓ کے غلام زبید سے کر دیا اور خود اپنا نکاح اپنی ایک باندی سے اُسے آزاد کر کے کر لیا۔ عبد الملک بن مروان نے اس پر طعن کیا تو امام عالیمقام نے جواب میں ارشاد فرمایا "ہم سب کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسوۂ حسنہ تھے۔ آپ نے حضرت صفیہ کو آزاد کر کے اپنا نکاح اُن سے کیا، اور اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کو اپنے غلام حضرت زید کے حبالۂ عقد میں دیا[1]۔

حفظِ ناموس

غلاموں اور باندیوں کے ناموس کی حفاظت بالکل احرار کے ناموس کی طرح کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص اس پر حملہ کرتا تو اُسے خاطر خواہ سزا ملتی تھی۔ عہدِ فاروقی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ کسی غلام نے ایک باندی کے ناموس کو مجروح کرنے کی کوشش کی، حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے غلام کے کوڑے لگوائے اور اُس کو شہر بدر کر دیا[2]۔

کسی غلام اور حُر میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا، تو غلامی اور آزادی سے صرفِ نظر کر کے معاملہ کی واقعی تحقیق کی جاتی تھی۔ اور پھر جس کا حق ثابت ہوتا تھا، اُسے بے تکلف دلا دیا جاتا تھا، ایک مرتبہ حضرت اُسامۃ بن زید مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور عمرو بن عثمان میں ایک جائداد سے متعلق نزاع ہوگیا، دونوں میں سے ہر ایک اُس کی ملکیت کا

[1] کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۹۴ [2] مؤطا امام محمدؒ باب الاستکراہ فی الزنا۔

دعویٰ کرتا تھا۔ عمرو بن عثمان نے کہا "اے اُسامہ! کیا تمہیں میرا مولیٰ بننے سے نفرت ہے؟
حضرت اُسامہ نے فرمایا "بخدا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ولاء کے بدلہ میں تو میں تجھ سے
نسبی تعلق قائم کرنے کو بھی قبول نہیں کر سکتا"۔ فیصلہ کے لیے دونوں حضرت معاویہ کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ سعید بن العاص اس مجلس میں موجود تھے، وہ یہ دیکھ کر عمرو بن عثمان
کے حامی ہو گئے اور اُسے حجت کی تلقین کرنے لگے۔ اب حضرت حسنؓ آگے بڑھے اور وہ حضرت
اُسامہ کے پہلو میں بیٹھ کر انہیں دلیل بتانے لگے۔ اس کے بعد عتبہ بن ابی سفیان، عمرو بن
عثمان کا حامی ہو گیا، اتنے میں امام حسینؓ بھی تشریف لے آئے اور وہ بھی حضرت اُسامہ کی
حمایت کرنے لگے۔ غرضکہ اس طرح دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک جانب عبدالرحمٰن بن ام الحکم اور
ولید بن عقبہ تھے جو عمرو بن عثمان کے حامی تھے۔ اور دوسری جانب حضرت عبداللہ بن
عباس اور عبداللہ بن جعفر تھے جو حضرت اُسامہ کی تائید کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے
دلائل و شواہد سُننے کے بعد امیر معاویہ نے فرمایا "جو اصل معاملہ ہے وہ مجھ کو معلوم ہے جب یہ
جائداد آنحضرتؐ نے اُسامہ کو عطا فرمائی تھی اُس وقت میں خود وہاں موجود تھا" اس فیصلہ
کو سن کر تمام ہاشمی جو یہاں موجود تھے بہت خوش ہوئے اور گھر واپس چلے آئے۔[۵]

تحصیل علم و فضل | غلاموں اور آزادوں میں سوشل مساوات اور برابری کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ
تحصیلِ علم و کمال کے دروازے دونوں پر یکساں کھُلے ہوئے تھے اور جو غلام اپنی فطری
استعداد، محنت اور ذاتی ذوق و شوق کے باعث علم و فضل میں کوئی نمایاں مقام حاصل
کر لیتے تھے اُن کی تعظیم و تکریم اُن کی علمی جلالتِ شان کے مطابق کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے
سلاطین و اُمراء اُن کی قدر دانی کرتے، اور اُن کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ عہدِ
تابعین تو اس لحاظ سے خاص طور پر مشہور ہے کہ اس زمانہ میں فقہ کے اکثر مراکز پر موالی کا
قبضہ تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ جب عبادلۂ ثلاثہ یعنی حضرت عبداللہ بن
عباس، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کا انتقال ہو گیا تو تمام ممالک

میں فقہ کے مراکز موالی کی طرف منتقل ہو گئے۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عطا بن ابی رباح، یمن میں طاؤس بن کیسان، یمامہ میں یحییٰ بن ابی کثیر، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم النخعی، شام میں مکحول الدمشقی اور خراسان میں عطاء الخراسانی فقہ میں مرجع امام تھے البتہ مدینہ میں صرف حضرت سعید بن المسیب فقہ کے امام سمجھے جاتے تھے، جو قرشی الاصل تھے[۱]۔ اُستاذ کرد علی جو عہدِ حاضر کے مشہور مُفکرِ اسلام اور مصنّف ہیں لکھتے ہیں:۔

"غلام زیادہ تر روم، فارس، حبش، سوڈان وغیرہ اُن قوموں میں سے ہوتے تھے جو جزیرۃ العرب کے پڑوس میں واقع تھیں اور جنہوں نے عربوں سے جنگ کی تھی اُن میں کثرت سے وہ لوگ تھے جن کی اولاد کو مسلمانوں نے اچھی تربیت دی اُن کو قرآن و سنت کا عالم بنایا جسکی وجہ سے یہ علم و فضل میں عربی الاصل صحابہ اور کبارِ تابعین کے ہمسر ہو گئے، کوئی شہر ایسا نہیں تھا جس میں طالبان علم موالی کی بھاری تعداد موجود نہ ہو اور بعض شہروں میں تو فقہاء موالی کی تعداد عرب فقہاء سے کہیں زیادہ تھی۔"[۲]

اسلام کی عام اخلاقی تعلیم اور خصوصاً اُن تعلیمات نے جو غلاموں اور باندیوں سے متعلق تھیں، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال نے عربوں کی پرانی ذہنی عصبیت میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی، لیکن پھر بھی عام لوگوں میں پُرانی ذہنیت کا کچھ اثر باقی تھا کہ اکابرِ صحابہ اور اہل بیت کے عمل نے اُس کا بالکل خاتمہ کر دیا، جاحظ کا بیان ہے کہ لوگ باندیوں سے نکاح کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اسی طرح جو باندیوں کے بطن سے ہوتے تھے ان کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن جب اُن لوگوں نے حضرت ابوالقاسم بن محمد بن ابی بکر سالم بن عبداللہ بن عمر اور علی بن الحسینؓ کو دیکھا کہ ان تینوں کی والدہائے محترمہ وہ خواتین تھیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں[۳]۔ اور اس کے باوجود مدینہ، حجاز اور عراق میں کیا تمام روئے زمین میں کوئی نہ تھا۔

[۱] معجم البلدان ج ۳ ص ۱۲۴ [۲] الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴

[۳] علی بن الحسینؓ کی والدۂ ماجدہ کے متعلق اس روایت کو اگرچہ ابن خلکان جیسے نامور مورخ نے قبول کیا ہے تاہم اس کی

جو عزت و شرف میں ان کا حریف بن سکے، تو ان لوگوں کی ذہنیتوں میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ابو العباس مبرد نے اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے جاحظ کی تائید ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں بھی حضرت ابو القاسم، سالم اور علی بن الحسین رحمہم اللہ کا تذکرہ ہے[1]۔

مسلمانوں کی اس پاک و صاف ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ قول استاذ کرد علی" وہ غلاموں کے ساتھ اپنا جیسا معاملہ کرتے تھے۔ اُن کے لئے فراخیِ عیش کے دروازے کھُلے رکھتے تھے، انہیں تعلیم دینے اور بہترین تربیت سے آراستہ کرتے تھے، ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ غلاموں کا نکاح اپنی بیٹیوں سے، اور اپنا نکاح لونڈیوں سے کرتے تھے، یہاں تک کہ غلام لطف و کرم کی اس روح پرور فضا میں رہ کر اپنے آپ کو آزاد، اور آقا کے گھر کا ایک فیملی ممبر سمجھتا تھا[2]۔

اس اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوکر، غلاموں، اور غلام زادوں نے تاریخ میں کیسے کیسے عجیب و غریب علمی اور عملی شاندار کارنامے کئے؟ اور مسلمانوں نے ان کے کمالاتِ ذاتی، اور علم و فضل کی کس طرح قدر کی؟ اور اسلامی سوسائٹی نے اُن کے ساتھ کس تعظیم و تکریم کا معاملہ کیا؟ یہ چند سوالات ہیں جن کے تحقیقی و مستند جوابات آپکو زیرِ نظر کتاب کے صفحات میں ملیں گے۔

آخر میں کتاب کی نسبت دو ایک باتیں عرض کرنی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ کیا گیا تھا، تو خیال تھا کہ اس میں محدثین و فقہاء، اور اولیاء و صوفیا کے ذکر کے ساتھ اُن سلاطین و اُمراء کا ذکر بھی شامل کر دیا جائے جنہوں نے غلام ہونے کے باوجود عظیم الشان سیاسی کارنامے انجام دیئے لیکن تاریخ و سیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سلاطین و امراء کا ذکر تو درکنار ایک ضخیم جلد میں تمام محدثین و فقہاء کا تذکرہ بھی نہیں آسکتا، چنانچہ اس کتاب میں بہت ہی منتخب اور نمایاں ارباب علم و فضل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر ان کا استیعاب کیا جاتا تو انہی کے حالات میں کئی جلدیں

---

[1] دیکھو الکامل للمبرد ج ۲ ص ۹۸ [2] الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴۔

ہو جاتیں - پھر غلام سلاطین و امرار بھی اس کثرت سے ہیں کہ اُن کے ذکر کے لئے ایک جلد کافی نہیں ہو سکتی تھی - اس بنار پر مجبوراً اس کتاب کو علمار و فضلار کے ذکر تک محدود رکھا گیا ہے -

دوسری بات یہ ہے کہ عربی زبان میں "مولیٰ" کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے - اس کے معنیٰ آزاد کردہ غلام بھی ہیں - اور مولیٰ اُس کو بھی کہتے ہیں جو عجمی ہونے کے باوصف کسی عربی خاندان میں مسلمان ہوا ہو، اور اس سے محالفت کرلی ہو - اس بنا پر میں نے یہ نہیں کیا کہ ہر وہ شخص جس کے نام کے آگے "مولیٰ" کا لفظ لکھا دیکھا اُس کو "غلامانِ اسلام" کی فہرست میں شامل کرلیا، بلکہ اپنی بساط کے مطابق تحقیق کی ہے کہ مولیٰ سے واقعی آزاد کردہ غلام مُراد ہے یا نہیں ؛ اسی بنا پر امام بخاری وغیرہ اصحاب کا ذکر چھوڑ دیا گیا جن کو بعض اربابِ سیر نے مولیٰ لکھا ہے - لیکن دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں ولارِ عتاقہ مراد نہیں بلکہ ولادِ اسلام مُراد ہے - اسی طرح میں نے امام شعبی وغیرہ ایسے اصحاب کا تذکرہ بھی شاملِ کتاب نہیں کیا ہے، جن کی نسبت ایک ضعیف سی روایت ہے کہ ان کی ماں جنگ جلولار کے قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت شعبی کے والد شرحبیل کے حصّہ میں آئی تھیں - کیونکہ اگر یہ روایت قوی ہوتی تب بھی اولاد چونکہ خیرالابوین کے تابع ہوتی ہے - اس لئے حضرت شعبی غلام نہیں کہلا سکتے تھے -

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے عہد صحابہ کے غلاموں کا تذکرہ ہے، پھر تابعین اور اُس کے بعد اتباعِ تابعین وغیرہم کا - یہ تقسیم طبقہ وار ہے - افسوس ہے کہ میں سنین کے اعتبار سے ترتیب قائم نہیں رکھ سکا یعنی اس میں آپ کو بعض اُن بزرگوں کے حالات پہلے ملینگے جن کا بعد میں انتقال ہوا ہے - اور جو سنہ وفات کے اعتبار سے اُن سے مقدم ہیں ان کا ذکر بعد میں ہے - ناموں کی تقدیم و تاخیر میں میں نے حتی الوسع جلالتِ مرتبت کا لحاظ ضرور رکھا ہے، لیکن کہیں کہیں اس کا خلاف بھی ہو گیا ہے -

واقعات کی تحقیق و تنقیح میں مقدور بھر محنت و جستجو سے کام لیا گیا ہے جو نہایت ہی مستند تاریخی مآخذ ہیں، اُن کی مدد سے معتبر اور بالکل صحیح واقعات فراہم کر کے اخذ ملط سے مرتب کئے گئے ہیں۔

مجھ کو یہ کہنے میں مسرت ہے کہ اگر برادر محترم مولانا عتیق الرحمان صاحب عثمانی خود کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح نہ کرتے تو یقیناً کتاب میں بعض جگہ میری کوتاہی کی وجہ سے نہایت فاحش غلطیاں رہ جاتیں، لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب اب بھی غلطیوں سے بالکل مبرا ہے۔ اوّل تو کوئی انسانی کام خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا اور پھر کام بھی اُس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اُس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ کی توفیق سے ہی انجام پذیر ہو سکا ہے۔

وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم وھو حسبی ونعم الوکیل

سعید احمد
ندوۃ المصنفین دہلی

۱۸- جون ۱۹۴۰ء

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

حضرت بلالِ بن رباح رضی اللہ عنہ

ابو عبداللہ کنیت، بلال نام، والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ اصل کے اعتبار سے حبشی تھے۔ مکہ میں پیدا ہوئے، اُمیّہ بن خلف اُن کا آقا تھا۔[1]

اسلام | آپ اُن سات "السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" میں سے تھے جنہوں نے توحید کی دعوت پر سب سے پہلے لبّیک کہا۔ اس "جرم" میں اُن کا آقا اُمیّہ بن خلف اُن کو سخت اذیتیں پہنچاتا تھا، تپتی ہوئی ریگ، اور جلتے ہوئے سنگریزوں پر اُن کو لٹا دیتا اور زد و کوب کرتا۔ مشرکین کے لڑکے اُن کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر اس زور سے کھینچتے کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ مگر توحید کی شراب طہور نے اُن کو جس کیفِ جاں نواز سے آشنا کر دیا تھا، اس کا نشہ کہیں ان تکلیفوں سے کم ہو سکتا تھا۔ ابوجہل اُن کو مُنہ کے بل سنگریزوں پر لٹا کر اوپر سے پتھر کی چکّی رکھ دیتا اور جب گرمی تیز ہو جاتی، تو پوچھتا "بلال! اب بھی محمدؐ کے خدا سے باز نہ آؤ گے؟" شمع نبوت کا یہ پروانۂ جاں نثار اس وقت بھی کہتا "اَحَد اَحَد"، یعنی خدا ایک ہے ایک ہے۔[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک روز اس حالت میں دیکھا تو خرید کر آزاد کر دیا۔

فضائل | حضرت بلال کی آواز نہایت شیریں اور دلکش تھی، اس لئے مدینہ طیبہ میں جب مسجد کی تعمیر ہو چکی اور نماز پنجگانہ کا اہتمام کیا گیا، تو حضرت بلال مؤذن مقرر ہوئے۔ آپ اِسلام کے سب سے پہلے موذن ہیں۔

آپ سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہتے تھے۔ یہاں تک

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت بلال [2] اسد الغابہ ذکر حضرت بلال۔

کہ غزوات میں بھی شریک رہے۔ معرکۂ بدر میں اُمیہ بن خلف انہی کی شمشیر آبدار سے قتل ہوا۔[1] فتح مکہ کے وقت کوکبۂ نبوی مکہ میں شان وتجمل کے ساتھ داخل ہوا تو حضرت بلال اُس وقت بھی ہمراہ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ "بلال! کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوکر اذان دو" اللہ اکبر! وہ حریم قدس جس کو اسلام کے معمار اولین حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے تعمیر کیا تھا، ایک عرصہ تک بتکدہ رہنے کے بعد پھر ایک حبشی نژاد غلام کی اذان توحید سے گونجا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:۔

ابوبکر سَیِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَیِّدَنَا یعنی	ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار
بِلالاً[2]	یعنی بلال کو آزاد کرایا۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں "ایک دن فجر کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو بلاکر پوچھا "اپنا کوئی ایسا عمل تم مجھ کو بتاؤ جس پر ثواب کی توقع سب سے زیادہ ہو کیونکہ میں نے تمہارے جوتوں کی آواز اپنے آگے جنت میں سُنی ہے۔ حضرت بلال نے فرمایا" میں نے ایسا عمل تو کوئی نہیں کیا، البتہ دن رات میں کوئی وضو ایسا نہیں ہے کہ اُس کے بعد میں نے نماز نہ پڑھی ہو"[3]۔

سبقت اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر وحضر میں ساتھ رہنے کے باعث حضرت بلالؓ کو جو شرف حاصل تھا، تمام صحابہ اُس کا احترام کرتے تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کسی کام کے لئے رؤسائے مکہ کا ایک گروہ باب خلافت پر حاضر ہوا اور باریابی کی اجازت طلب کی۔ ان کے ساتھ حضرت بلالؓ بھی تھے حضرت عمرؓ

---

[1] حضرت ابوبکر نے اس موقع پر خوش ہوکر یہ شعر پڑھا:۔

هنیأ زادك الرحمٰن خیرًا　　فقد ادرکت ثارك یا بلال

مبارک ہو خدا تمہارے لئے خیر وبرکت کو زیادہ کرے، تم نے اے بلال اب اپنا بدلہ پالیا

[2] بخاری باب مناقب حضرت بلال۔

[3] صحیح بخاری باب فضل الطہور باللیل والنہار

نے سب سے پہلے حضرت بلالؓ کو اندر بلایا۔ بعض سردارانِ قریش کو یہ بات ناگوار گزری اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شرفاء منتظر بیٹھے ہیں اور ایک غلام کو شرفِ باریابی حاصل ہو رہا ہے۔ اس پر عکرمہ بن ابی جہل نے کہا "بلانے والے نے سب کو ایک آواز سے بلایا، لیکن ہم نے اُس وقت بھی اُس آواز کو بعد میں سُنا۔ لہٰذا اب بھی وہ ہی لوگ پہلے باریابی حاصل کرنے کے حقدار ہیں جنہوں نے اسلام کی آواز پر ہم سے پہلے لبیک کہا۔ آج ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔"

نکاح آپ نے متعدد نکاح کئے تھے اور اُن کی بعض بیویاں عرب کے شریف و معزز خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ابن ابی بکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہماری ہمشیرہ کا نکاح کسی سے کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا "تم بلال کو چاہتے ہو؟" وہ پھر واپس آئے اور یہی عرض کیا۔ حضور نے پھر وہی فرمایا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، بالآخر وہ راضی ہو گئے اور کہا "آپ کو اختیار ہے"۔ چنانچہ آپ[۱] نے ابوبکر کی صاحبزادی کا نکاح حضرت بلال سے کر دیا۔ حضرت قتادہ کی روایت کے مطابق آپ کا ایک نکاح بنو زہرہ کی ایک عرب عورت سے بھی ہوا تھا[۱]۔ اور آپ کی بیوی کا نام ہند الخولانیہ[۲] تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت بلال ملک شام میں جا کر متوطن ہو گئے تھے۔ بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں بھی ایک نکاح کیا تھا۔[۳]

---

۱ طبقات ابن سعد ص ۱۶۹ جلد ۳   ۲ ابن عساکر ص ۳۰۱ جلد ۳

۳ مولانا شبلی نے حضرت بلال کے واقعۂ نکاح کو مؤثر پیرایہ میں نظم کیا ہے، ہم اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال ـــ کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں ـــ جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
ہوں غلام ابن غلام اور حبشی زادہ ـــ یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
اِن فضائل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے ـــ ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے عذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور ـــ جس طرف اس حبشی زادہ کی اُٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروق میں جس دن کہ ہوئی اُنکی وفات ـــ یہ کہا حضرت فاروق نے بادیدۂ تر

حلیہ حضرت بلال کا جسم لاغر، رنگ سیاہ، اور قد نہایت طویل تھا۔ سر کے بال نہایت گھنے، خمدار، اور اکثر سفید تھے[1]

وفات ۲۰ھ میں کم وبیش ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن ہوئے[2]

اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا! اٹھ گیا آج نقیب حشمِ پیغمبر
اس مساوات پہ ہے معشرِ اسلام کو ناز نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر!

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۷۰ [2] اسد الغابہ ذکر حضرت بلال :۔

حضرت صُہَیب بن سِنان

صہیب نام اور ابو یحییٰ کنیت تھی، والد کا نام سنان، اور والدہ کا نام سلمیٰ بنت قعید تھا ان کے والد اور ان کے چچا شاہ فارس کی طرف سے مقام ابلہ میں حاکم تھے۔ اِن لوگوں کے مکانات لبِ دجلہ شہر موصل کے پاس تھے۔ اہل روم نے ان پر شبخون مارا اور حضرتِ صہیب کو جو اُس وقت صغیر السن تھے پکڑ کر لے گئے اور غلام بنا لیا۔ پھر ان کو قبیلۂ کلب کے لوگوں نے خرید لیا اور مکہ لے آئے۔ عبد اللہ بن جدعان نے کلب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ وہ خود بھاگ کر آئے تھے اور عبد اللہ بن جدعان سے مخالفت کر لی تھی۔ اور ابن جدعان کی اخیر زندگی تک اُس کے ساتھ رہے۔[1]

اسلام | مکہ معظمہ میں بتیس آدمی اسلام لا چکے تھے کہ حضرت صہیب، حضرت عمار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ آپ نے ان میں اور حارث بن صمہ کے درمیان مواخات کرا دی تھی۔

کفار و مشرکین مکہ نے ان پر طرح طرح کے جانگسل مصائب توڑے۔ بالآخر حضرت علی کی معیت میں ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ مکہ سے روانہ ہو رہے تھے کہ کفار نے تعاقب کیا۔ اُنہوں نے اپنا ترکش سنبھال لیا، اور فرمانے لگے "اے قریش کے لوگو! تم جانتے ہو میں تم سب سے اچھا تیر انداز ہوں، خدا کی قسم تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے یہاں تک کہ جتنے تیر میرے پاس ہیں، وہ سب میں تم پر ختم کر دونگا، اور اس کے بعد اپنی تلوار سے کام لونگا جب تک وہ میرے ہاتھ میں رہیگی"۔ ہاں اگر تم میرا مال چاہتے ہو تو میں تمہیں بتا دوں۔ ان لوگوں نے کہا "اچھا تم ہمیں اپنا مال ہی بتا دو"، چنانچہ حضرت صہیب نے اُن کو اپنے مال کا

[1] اسد الغابہ باب الصاد والہاء [2] طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۳۔

پتہ بتا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا "اے ابویحیٰ! تمہاری تجارت بہت اچھی رہی۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ

بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی جان اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

مزاح طبیعت میں مزاح بحد تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں مکہ سے روانہ ہو کر قبا میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ کے سامنے کھجوریں رکھی ہوئی تھیں اور آپ ان کا شغل کر رہے تھے، میری ایک آنکھ آشوب کر آئی تھی۔ راستہ میں تشنگی اور بھوک کا غلبہ رہا تھا اس لئے جاتے ہی میں نے کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "کیا تم آشوب چشم کی حالت میں بھی کھجوریں کھاتے ہو؟" میں بولا "یا رسول اللہ! میں اُس آنکھ کی طرف سے کھاتا جو اچھی ہے۔ سرورِ کائناتؐ یہ سنتے ہی مسکرانے لگے، یہاں تک کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے[2]۔

غزوات حضرت صہیب تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر، احد، خندق اور تمام دوسرے معرکوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ عالمِ پیری میں وہ لوگوں کو جمع کر کے نہایت لطف کے ساتھ اپنے جنگی کارناموں کی دلچسپ داستان سُنایا کرتے تھے۔

حضرت عمر کو ان سے بہت محبت تھی انہوں نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ حضرت صہیب ہی میرے جنازے کی نماز پڑھائیں اور اہل شوریٰ جب تک مسئلۂ خلافت کو طے نہ کریں وہ خلیفہ کے فرائض انجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے تین دن تک بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ امامت کا فرض انجام دیا[3]۔

حضرت صہیب کا بچپن رومیوں میں گزرا تھا۔ اس لئے زبان میں عجمیت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے "اے صہیب تم میں صرف تین باتیں ہیں جن کو میں بُرا سمجھتا ہوں

[1] اسد الغابہ ذکر حضرت صہیب [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۹ و اسد الغابہ [3] اسد الغابہ ص ۳۳ ج ۳

اگر وہ نہ ہوتیں تو میں کسی کو تم پر فضیلت نہ دیتا میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے کو عرب کی طرف منسوب کرتے ہو حالانکہ تمہاری زبان عجمی ہے اور تم اپنی کنیت ابو یحییٰ بتاتے ہو جو ایک نبی کا نام تھا، اور اپنا مال فضول خرچ کرتے ہو"۔ حضرت صہیب نے فرمایا! میں مال بیجا خرچ نہیں کرتا۔ اور میری کنیت ابو یحییٰ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی ہے۔ لہٰذا میں اس کو ترک نہ کروں گا، اور میں اپنے تئیں جو عرب کی طرف منسوب کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں درحقیقت عربی ہی ہوں، مگر کمسنی میں اہل روم مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس لئے میں نے ان کی زبان حاصل کرلی[1]

حلیہ حضرت صہیب کا قد درمیانہ تھا، نہ بہت کوتاہ، نہ زیادہ دراز، رنگ بہت سرخ تھا سر کے بال گھنے تھے، بڑھاپے میں مہندی کا خضاب کرتے تھے[2]

وفات ۳۸ھ میں بماہ شوال مدینہ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔ بقیع میں مدفون ہوئے[3]

فضائل آپ نے متعدد حدیثیں بھی روایت کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "صہیب روم کا پھل ہے" اور آپ کی دلجوئی کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ایک بار ابو سفیان (مسلمان ہونے سے قبل) حضرت سلمان، حضرت بلال اور حضرت صہیب کے پاس سے گزرا تو ان تینوں نے کہا "اللہ کی تلوار نے اب تک اس دشمن خدا کی گردن نہیں اڑائی" حضرت ابوبکر نے یہ سنا تو فرمایا "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا "تم نے شاید ان کو خفا کر دیا؟ اگر واقعی ناراض کر دیا ہے تو گویا تم نے اپنے خدا کو ناراض کر دیا" یہ سن کر حضرت ابوبکر ان تینوں بزرگوں کے پاس آئے۔ اور فرمایا "اے میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا؟" انہوں نے کہا "نہیں ہم غضبناک نہیں ہوئے اے بھائی خدا تمہاری مغفرت کرے۔[4]

حضرت صہیب کی نسبت ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

[1,2] طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ جلد ۳ [3] اسد الغابہ ذکر حضرت صہیب [4] صحیح مسلم بحوالہ کتاب التاج الجامع للاصول ج ۳ ص ۳۴۴

نِعْمَ العبد صُهیب لولم یخفِ اللّٰہ لم یعصِہٖ[1]

صہیب اچھے بندے ہیں، اگر وہ اللہ کا خوف نہ کرتے، تب بھی اُس کی معصیت نہ کرتے۔

اسلام کی ایک یہ بھی عجیب شان ہے کہ وادیِ فاران کے داعیِ حق کی دعوتِ توحید پر کفر و شرک کی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود جن بزرگوں نے سب سے پہلے اِس دعوت کو قبول کیا، اُن میں حضرت ابوبکر ایسے بزرگ قریش کے ساتھ حضرت بلال، حضرت صہیب حضرت عمّار اور حضرت خبّاب ایسے "غلاموں" کے اسمار گرامی بھی نظر آتے ہیں جن کی ذات گرامی اسلام کے لئے سرمایۂ افتخار، اور جن کے اعمال مسلمانوں کے لئے باعثِ تقلید تھے یہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے سطوتِ اسلام کا پرچم لہرایا، اور اُس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اہلِ عالم سے کرایا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہُ۔

[1] صحیح مسلم بحوالۂ کتاب التاج الجامع للاصول ج ۳ ص ۴۴۲

حضرت سلمان فارسیؓ

نام و نسب اسلام سے پہلے آپ کا نام مابہ تھا، مجوسی المذہب تھے، آپ کے والد اصفہان کے قریہ جی کے باشندے تھے۔ بعض کہتے ہیں آپ فارس کے شہر رامہر مز سے تعلق رکھتے تھے والد کا نام یوذخشان بن مورسلان تھا جو فارس کے ایک آتشکدہ کی خدمت کرتے تھے، صیغۂ معاش کاشتکاری و زمینداری تھا[۱]۔

اسلام سے پہلے حضرت سلمان کے والد ان کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو لڑکیوں کی طرح گھر سے باہر نہ جانے دیتے تھے، حضرت سلمان فطرۃً مذہبی جوش و ولولہ لے کر آئے تھے۔ اس لیے آتش کدہ کی خدمت اس انہماک سے کرتے تھے کہ آگ برابر روشن رہتی تھی۔

عیسائیت کی طرف میلان ایک مرتبہ والد نے کہا کہ میں اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لئے خود جا نہیں سکتا، تم ہو آؤ۔ سلمانؓ راضی ہو گئے۔ راستہ میں ایک گرجا ملا۔ جس میں اُس وقت نماز ہو رہی تھی، سلمانؓ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا گھر آئے تو والد کو اس کو خبر ہوئی وہ بہت برہم ہوئے اور اُن کو گھر میں مقید کر دیا۔ اُنہوں نے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ کوئی قافلہ شام جائے تو مجھ کو اُس کی خبر کرنا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ سلمان موقع پا کر اس قافلہ کے ساتھ شام کی طرف چل دیے، جہاں پہنچ کر اُنہوں نے معلوم کیا کہ عیسائیوں کا یہاں سب سے بڑا پیشوا کون ہے؟ لوگوں نے کہا، بشپ۔ سلمان اس بشپ کے پاس گئے اور اس کے کیرکٹر کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ شخص انتہا درجہ کا ذلیل فطرت اور بدعمل تھا۔ سلمان اس کی بدعملی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتے تھے مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ آخر کار وہ مرگیا، اور اُس کا قائم مقام جو دوسرا بشپ ہوا

---

[۱] لیکن ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت سلمان ایک بادشاہ کے لڑکے تھے۔ حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

وہ بڑا عابد وزاہد اور تارک الدنیا تھا۔ سلمان اُس سے بہت مانوس تھے جب یہ مرنے لگا تو سلمان نے پوچھا اب میں کس کے پاس جاؤں۔ اُس نے موصل کے کسی شخص کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ سلمان یہاں آئے تو دیکھا کہ واقعی یہ شخص بڑا عابد وزاہد اور متقی و پرہیزگار ہے مگر چند روز کے بعد جب اس کا بھی انتقال ہونے لگا تو اُس نے سلمان کو وصیت کی کہ مقام نصیبین کے فلاں شخص کے پاس چلے جائیں۔ بشپ کی وصیت کے مطابق سلمان نے نصیبین آکر دیکھا کہ واقعی یہ شخص بھی پہلے دو بشپوں کی طرح عابد وزاہد ہے اتفاق کی بات چند روز کے بعد اس کا بھی انتقال ہوگیا اور اس کی وصیت کے مطابق حضرت سلمان عموریہ آئے۔ یہاں اُنہوں نے کچھ بکریاں خرید لیں اور اُن سے معاش کا انتظام کرنے لگے۔ آخر کار وقت آیا کہ اس اسقف کا ساغر حیات بھی چھلکنے لگا۔ سلمان نے اُس سے کہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ بشپ بولا۔ اب میری نظر میں کوئی بشپ ایسا نہیں ہے جس کے پاس جانے کی میں تم کو ہدایت کروں البتہ ہاں اُس نبی کے ظہور کا انتظار کرو جو ریگستان عرب سے اُٹھ کر دین براہیمی کو زندہ کریگا۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ وہ ہدیہ قبول کریگا لیکن صدقہ کو اپنے لئے حرام سمجھیگا۔ اس کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اگر تم اس سے مِل سکو تو ضرور ملنا۔

غلامی اس بشپ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک حضرت سلمان عموریہ میں مقیم رہے۔ کہ اتنے میں بنو کلب کا ایک قافلہ ان کے پاس سے گزرا۔ سلمان نے ان لوگوں سے کہا کہ میں تم کو اپنی بکریاں اور گائیں دیدوں گا تم مجھ کو اپنے شہر میں لے چلو۔ قافلہ راضی ہوگیا۔ اور حضرت سلمان اُن کے ساتھ چلے آئے۔ مگر بعد میں ان لوگوں نے غداری کی۔ وادی القریٰ پہنچ کر اُنہوں نے حضرت سلمان کو غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے یہاں کھجوریں دیکھیں تو سمجھے میرا گوہر مقصود یہیں ملیگا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے حضرت سلمان اپنے آقاؤں کی شدید سختیوں کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے پھر جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اُسی دوران میں بنو قریظہ کے ایک

شخص نے حضرت سلمان کو خرید لیا، اور اپنے ہمراہ اُن کو لے کر مدینہ چلا آیا۔

قبولِ اسلام قیام مدینہ کے زمانہ میں حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے باغ میں ایک درخت پر کام کر رہا تھا۔ اتنے میں اُس کا ایک چچازاد بھائی آیا اور کہنے لگا خدا بنی قیلہ (انصار) کو غارت کرے میں اُن کے پاس سے ابھی گزرا تو دیکھا کہ ایک شخص جو اپنے تئیں نبوت کا دعوٰی کرتا ہے۔ اور جو مکہ سے آیا ہے۔ یہ سب لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہیں۔ میں یہ سُنتے ہی اس درجہ اثر پذیر ہوا کہ ایک بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ قریب تھا کہ درخت سے گر پڑوں بڑی عجلت کے ساتھ اپنے آقا کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اُس نے میرے طمانچہ مارا اور کہنے لگا" جا اپنا کام کر، تجھ کو ان باتوں سے کیا غرض؟" حضرت سلمان اُس وقت تو خاموش ہو گئے۔ رات ہوئی تو کوئی چیز لے کر قبا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے پاس یہ چیز جمع ہو گئی تھی۔ اب میں اس کو آپ کے پاس بہ طور صدقہ لے کر آیا ہوں کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک صالح بزرگ ہیں، اور آپ کے ساتھ حاجتمند لوگ ہیں آنحضرت نے اُس کو دیکھ کر اپنا دستِ مبارک روک لیا، اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا " کھاؤ۔ چنانچہ وہ سب کھانے میں مشغول ہو گئے اور سلمان واپس چلے آئے۔ پھر ایک مرتبہ اور آپ کی خدمت میں حسب سابق کوئی چیز لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا یہ آپ کے لئے ہدیہ ہے صدقہ نہیں۔ آپ نے دست مبارک بڑھایا اور اُس میں سے خود بھی کھایا اور دوستوں کو بھی کھلایا۔ حضرت سلمان فرماتے ہیں" میں نے یہ دیکھ کر کہا" یہ دو علامتیں تو صحیح نکلیں، اب ایک خاتم نبوت کی علامت اور رہ گئی ہے، اُس کا بھی امتحان کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ ایک اور دن حضرت سلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اُس وقت ایک جنازہ کے ساتھ بقیع الغرقد جا رہے تھے۔ حضرت سلمان خاتم نبوت دیکھنے کی غرض سے پیچھے ہو گئے آنحضرت نے اُن کا منشاء معلوم کر لیا۔ اور اپنے دوشِ مقدس سے چادر سرکا دی۔ حضرت سلمان نے خاتم نبوت دیکھی تو فوراً بڑھ کر بوسہ دیا اور رونے لگے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اب حضرت سلمان نے آپ کو اپنا پورا واقعہ سنایا جس سے آپؐ نے بڑی دلچسپی لی، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے اصحاب بھی اُس کو سُنیں۔ اُس وقت حضرت سلمانؓ[1] اُس دولتِ لازوال کے مالک تھے جس کی تلاش وجستجو میں وہ اب تک سرگرداں پھرتے رہے تھے۔

آزادی | لیکن غلامی کے باعث وہ آزادی کے ساتھ تمام اسلامی فرائض انجام نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ آپ بدر واحد کے معرکوں میں شرکت نہیں فرما سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمان کی اس مجبوری و بے بسی کو محسوس کرتے تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا، "تم اپنے آقا سے مکاتبت[1] کر لو، حضرت سلمان نے آقا سے اُس کی خواہش ظاہر کی۔ معاملہ تین سو کھجور کے درخت لگانے اور چالیس اُوقیہ سونے کے ادا کرنے پر طے ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم فرمایا کہ کھجور کے درخت لگانے میں سلمان کی مدد کریں۔ سب نے حسبِ مقدرت اُن کی امداد کی۔ جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ رہا سونا، اُس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ایک شخص انڈے کی برابر سونا لئے ہوئے حاضر خدمت ہوا۔ تولنے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک چالیس اوقیہ تھا۔ آنحضرت نے بُلا کر حضرت سلمان کو دلوا دیا جس کو ادا کر کے وہ نعمتِ آزادی سے بہرہ اندوز ہو گئے۔

مواخاۃ | آزادی کے بعد عرب کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ کسی کے حلیف ہو کر رہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان کی مواخات حضرت ابوالدرداءؓ سے کرا دی۔

غزوۂ خندق | آزادی کے بعد سب سے پہلا معرکہ خندق کا پیش آیا حضرت سلمان نے اُس میں بڑے جوش وخروش اور شوق وذوق کے ساتھ شرکت فرمائی، بلکہ حق یہ ہے کہ اس معرکہ کی کامیابی ظاہری اسباب کے پیشِ نظر بڑی حد تک حضرت سلمان کی تجربہ کاری، دانائی اور فراست

---

[1] یعنی کوئی معاوضہ دے کر آزادی حاصل کرو۔

[2] شروع سے یہاں تک کے تمام حالات اُسد الغابہ جلد ۲ ص ۳۲۸ و ۳۲۹ و ۳۳۰ و ۳۳۱ سے ماخوذ ہیں

کے ہی باعث تھی۔ اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل ایک زبردست جمعیت کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف اُمنڈ آئے تھے۔ حملہ مدینہ پر تھا جس کے ارد گرد نہ قلعہ تھا اور نہ فصیل تھی۔ اُدھر دشمنوں کی جمعیتِ کثیر، اور مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، حضرت سلمان ایران کی معرکہ آرائیاں دیکھے ہوئے تھے۔ جنگ کے اصول سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت سلمان نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے کھُلے میدان میں جنگ نہ کرنی چاہئے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ چاروں طرف خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا جائے، اس تجویز کو پسند کیا گیا، خندق کھودی گئی تو اُس کی کھُدائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس شریک تھے۔ آپؐ نے انصار و مہاجرین کی یہ محنت و مشقت دیکھی تو بے ساختہ زبانِ مبارک سے نکلا اللّٰھم انّ العیش عیش الاٰخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ (ترجمہ: اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار و مہاجرین کو بخش دے) فداکاران رسالت پناہ نے نبوت کی لسانِ صدق و محبت کو یوں نوا پیرا دیکھا تو جوشِ اطاعت میں بول اُٹھے۔

نحن الّذین بایعوا محمّدًا — علی الجھاد ما بقینا ابدًا[1]

ہم ہی ہیں وہ جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم زندہ رہینگے

یہ واقعہ ۵۔ ذی قعدہ ۵ھ کا ہے۔ حضور پُر نور نے خود حدود قائم کیں۔ داغ بیل ڈالکر دس دس گز زمین دس دس آدمیوں پر تقسیم کر دی۔ انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا کہ حضرت سلمان کدھر رہینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سلمانُ منّا اھل البیت (سلمان تو ہمارے اہلِ بیت میں سے ہے)

حافظ ابن حجر کی روایت کے مطابق دشمنان اسلام چوبیس ہزار کی فوجِ گراں لئے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ یہاں آکر دیکھا خندق کھُدی ہوئی ہے اور اندر پہنچنا سخت دشوار ہے۔ وہ اس طریقۂ جنگ سے پہلے سے بے خبر تھے وہیں محاصرہ کرکے پڑ گئے

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

تقریباً ایک ماہ تک مسلسل محاصرہ قائم رہا۔ مگر شہر تک پہونچنا اُن کو نصیب نہ ہوا۔ مشرکین میں سے عمرو بن عبدود ایک مشہور بہادر جنگجو تھا، وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور خندق عبور کر گیا اب اُس نے عرب کے دستور کے مطابق للکار کر کہا "کون ہے جو میرے مقابل آئے"۔ حضرت علی نے فرمایا: "میں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی اور عمامہ باندھا، کچھ گفتگو کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی۔ عمرو بن عبدود کے پہلے وار کے بعد حضرت علی نے اس زور سے حملہ کیا کہ اُن کی تلوار حریفِ مقابل کا شانہ کاٹ کر نیچے اُتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علی نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس فتح میں بڑا دخل خندق کو تھا، جس کا مشورہ حضرت سلمان نے ہی دیا تھا، اس لئے اس غزوہ کی کامیابی کو حضرت سلمان کے فضائل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خندق کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرت سلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:-

ولم یتخلف عن مشهد بعد الخندق[۱] — خندق کے بعد آپ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد فاروقی کی ایرانی جنگوں میں بھی آپ شریک ہوئے اور چونکہ یہ خود ایرانی الاصل تھے اور جنگ کے طریقوں سے پوری طرح باخبر، اس لئے آپ سے اسلامی لشکر کو بڑی مدد ملی۔

گورنری حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدائن کے گورنر تھے۔ اس کے باوجود درویشی و فقر کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے، اور اُس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے[۲]

زہد و اتقاء زہد و اتقاء کی شان یہ تھی کہ عمر بھر کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ حضرت حذیفہ نے حضرت سلمان سے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے ایک مکان بنا دیں" حضرت سلمان

[۱] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۰ و ۳۹۲۔ [۲] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۲ [۳] طبقات ابن سعد ذکر حضرت سلمان

نے فرمایا "کیوں! کیا تم میرے لئے ایسا مکان بنانا چاہتے ہو جیسا کہ تمہارا مکان مدائن میں ہے؟" حضرت خذیفہ نے کہا "نہیں ہم آپ کے لئے بانس کا مکان بنائینگے، جس کی چھت گھاس اور پھوس کی ہوگی، اور جو اس قدر مختصر ہوگا کہ آپ کھڑے ہونگے تو اُس کی چھت آپ کے سر کو لگیگی۔ اور آپ لیٹینگے تو اُس کی دیواریں آپ کے دونوں پہلوؤں کو لگیں گے۔ حضرت سلمان بولے "تم نے میرے دل کی بات پالی"[1]۔

پہلے گزر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان دونوں میں مواخات کرادی تھی۔ حضور پرنور کی وفات کے بعد ابوالدرداء شام چلے گئے۔ اور حضرت سلمان عراق میں قیام پذیر تھے۔ شام سے حضرت ابوالدرداء نے اپنے بھائی کو لکھا "میں یہاں بہت خوش ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مال واولاد دونوں کی نعمت وافر عطا فرمائی ہے اور میں یہاں ارض مقدس میں ہوں" آپ نے اس کا جواب لکھا "سنو! مال واولاد کی کثرت یا ارض مقدس میں ہونا خیر نہیں ہے بلکہ خیر یہ ہے کہ تم کوئی ایسا عمل کرو جو تمہارے لئے مفید ہو، اور تم اپنے تئیں مردہ لوگوں میں سے سمجھو"[2]۔

فضائل حضرت سلمان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تقرب حاصل تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں "سلمان رات کو دیر تک آپ کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں آپ ہم سے غافل نہ ہو جائیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے۔ علی، عمار اور سلمان"۔ حضرت علی سے کسی نے حضرت سلمان کے علم کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا "انہیں اول وآخر کا علم دیا گیا ہے اور وہ ایک ایسے سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا"[3]۔ حضرت صہیب کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق صہیب، بلال اور سلمان پر ناراض ہو گئے۔ آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق سے

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱ [2] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱ [3] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱

ناراضگی کا اظہار کیا جس پر انہیں پشیمان ہونا پڑا۔

ایک دفعہ حضرت سلمان نے اپنے اسلامی بھائی ابو درداء کی بیوی کو آشفتہ حال دیکھا پوچھا "تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے" وہ کہنے لگی "میں کس کے لئے بناؤ سنگار کروں۔ تمہارے بھائی تو بالکل ہی تارک دنیا ہو گئے ہیں" حضرت ابو الدرداء مکان پر تشریف لائے تو حضرت سلمان کے لئے کھانا منگایا، مگر خود معذرت کی کہ میں روزہ سے ہوں۔ حضرت سلمان بولے "تو میں بھی کھانا نہ کھاؤنگا" رات کو آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ شب کے آخر میں حضرت ابو درداء عبادت کے لئے اُٹھے تو آپ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "تم پر تمہارے رب، تمہاری آنکھ اور تمہاری بیوی کا سب کا حق ہے۔ روزوں کے ساتھ افطار اور شب بیداری کے ساتھ سونا بھی ضروری ہے۔ اگلے دن صبح کو دونوں نے یہ معاملہ بارگاہِ رسالت پناہ میں پیش کیا" آپ نے ابو الدرداء سے مخاطب ہو کر فرمایا "سلمان تم سے زیادہ مذہب سے واقف ہیں"۔ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقرب خاص رکھنے کی وجہ سے صحابۂ کرام بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت عمر کے پاس آئے۔ آپ اُس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمر نے آپ کو دیکھتے ہی تکیہ آپ کے لئے ڈال دیا حضرت سلمان نے فرمایا "اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ فرمایا" عمرؓ بولے "اے ابو عبداللہ کچھ بیان کیجئے آپ نے فرمایا "میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت آپ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپ نے اس کو میرے سامنے ڈال دیا۔ پھر فرمایا "اے سلمان جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اس کے لئے ازراہِ تعظیم و تکریم اپنا تکیہ پیش کر دے تو خدا اس کی مغفرت کر دیگا"۔ [2]

حضرت معاذ بن جبل خود بہت بڑے عالم اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ اُنھوں

---

[1] استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۲ [2] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۹۹

نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں سے کہا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا، ان میں ایک حضرت سلمان کا بھی نام تھا۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان علم سے پُر ہےؔ۔ آپ نے اُن کو "سلمان الخیر" کا لقب بھی عطا فرمایا تھا۔

علالت اور وفات آپ کی عمر کے متعلق ارباب سیر و تاریخ نے عجیب و غریب روایتیں لکھی ہیں۔ صاحب اصابہ فرماتے ہیں "اس میں تو کسی کو شک ہی نہیں کہ حضرت سلمان کی عمر ڈھائی سو برس کی تھی۔ پھر ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے اسّی برس کی عمر پائی تھی"

بہر حال حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں علیل ہوئے۔ حضرت سعد آپ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، آپ رونے لگے۔ سعد نے فرمایا "آپ روتے کیوں ہیں؟ اب موت قریب آرہی ہے۔ آنحضرت صلعم آپ سے خوش دنیا سے رخصت ہوئے تھے اب آپ وہاں ان سے جاکر ملینگے۔ بولے خدا کی قسم! میں موت سے نہیں گھبراتا۔ اور نہ دنیا کی حرص میری دامنگیر ہے۔ رونا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمارا سامان ایک مسافر کے سامان رحلت سے زیادہ نہ ہو، اور میرے پاس اس قدر سانپ جمع ہیں" سعد فرماتے ہیں کہ کل سامان جس کو سانپ سے تعبیر کیا گیا تھا، یہ تھا۔ ایک بڑا پیالہ، ایک لگن اور ایک تسلہ۔ اس کے بعد سعدؓ نے کہا "مجھ کو کوئی نصیحت کیجئے" فرمایا "جب کسی کام کا قصد کرو، فیصلہ کرو یا تقسیم کرو تو خدا کو یاد رکھوؔ"

حضرت سعد کے علاوہ دوسرے احباب نے بھی آپ سے وصیت و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ حج، عمرہ، جہاد کرتے یا قرآن پڑھتے ہوئے جان دے اور گناہ و معصیت کی حالت میں نہ مرے"۔ آخر لمحات زندگی میں سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب آئے تو دیکھا آشیانۂ قدس کا طائر زرّیں بال قفس عنصری سے جدا ہو کر ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گیا ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

لہ طبقات ابن سعد جزء ۴ ص ۶۱   ۲ے ابن سعد جزء ۴ ص ۶۵۔

حضرت زید بن حارثہ رضؓ

نام و نسب | زید نام، کنیت اُسامہ حِبِّ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی "آنحضرتؐ کے محبوب" لقب تھا۔ والد کا نام حارثہ اور ماں کا نام سعدیٰ بنت تعلبہ تھا، والدین سے ایک نہایت معزز قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور والدہ قبیلہ طے کی ایک شاخ بنو معن سے تھیں۔

غلامی | حضرت زید ابھی صغیر السن تھے کہ اُن کی والدہ اُنہیں ساتھ لے کر اپنے قبیلہ بنو معن کے پاس گئیں راہ میں بنو قین کی ایک جماعت نے غارتگری کی اور زید کو غلام بنا کر بازار عکاظ میں بیچنا چاہا۔ حکیم بن حزام نے اپنی پھوپی حضرت خدیجہ بنت خولد رضی اللہ عنہا کے لئے چار سو درہم کے بدلے میں خرید کر لیا۔ سعادتمندی واقبال ازل میں مقدر ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہ نے (نبوت سے قبل) انہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور ہبہ پیش کر دیا۔ اس وقت حضرت زید کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ سرورِ عالم نے اُن کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا چنانچہ لوگ عام طور پر آپ کو "زید بن محمدؐ" کہا کرتے تھے۔ پھر جب آیت "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ" (لوگوں کو اُن کے باپوں کے نام سے بلاؤ) نازل ہوئی تو یہ کہنا چھوڑ دیا گیا۔

حضرت زید کے والد کو ان کے اس طرح گم ہو جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہ سب کے چہیتے اور لاڈلے تھے۔ صاحب اُسد الغابہ اور ابن سعد نے اُن کے چند اشعار جو اُنہوں نے فراق فرزند سے بے تاب ہو کر کہے تھے، نقل کئے ہیں:۔

۱۔ بکیت علی زید ولم ادر ما فعل — اَحَیٌّ فیرجی ام اتی دونہ الاجل

۲۔ فواللہ ما ادری وان کنت سائلا — اغالک سھل الارض ام غالک الجبل

۳۔ فیالیت شعری ھل لک الدھر رجعۃ — فحسبی من الدنیا رجوعک لی بجل

۴. تذکرنیہ الشمس عند طلوعها وتعرض ذکراہ اذا قارب الطفل

۵. وان ھبّت الارواح ھیّجن ذکرہٗ فیاطول ما حزنی علیہ ویا وجل

۶. ساعمل نصّ العیس فی الارض جاھدًا ولا اسأم التطواف اوتسأم الابل

۷. حیاتی اوتاتی علیّ منیّتی وکلّ امرءٍ فانٍ وان غرّہ الامل

۸. واوصی بہ قیسًا وعمرًا کلیھما واوصی یزیدًا ثمّ من بعدھم جبل

ترجمہ

۱. میں زید کے لئے رویا پیٹا پھر بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اُس کا حال کیا ہے - آیا وہ زندہ ہے کہ پھر اس سے ملنے کی توقع کی جائے، یا وہ مرگیا ہے -

۲. بخدا اگرچہ میں سوال کرتا پھرتا ہوں لیکن پھر بھی نہیں جانتا کہ تجھ کو نرم زمین نے ہلاک کردیا یا سخت زمین تجھ کو لے بیٹھی -

۳. اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تو کبھی واپس آئیگا یا نہیں - تیرا واپس آنا ہی میرے لئے دنیا میں بہت کافی ہے -

۴. آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اُس کی یاد دلاتا ہے، اور پھر جب ڈوبنے کے قریب ہوتا ہے تو اُس وقت بھی اُس کی یاد پیش آتی ہے -

۵. ہوائیں چلتی ہیں تو وہ بھی اُس کی یاد کو بھڑکا دیتی ہیں - آہ! میرا غم کتنا طویل و دراز اور میرے خوف کا کیا عالم ہے

۶. میں پوری کوشش کے ساتھ دنیا بھر میں اونٹ پر بیٹھ کر چکر لگاؤں گا اور ان چکروں سے تھکونگا نہیں، یہاں تک اونٹنی ہی تھک جائے -

۷. زندگی بھر، یہاں تک کہ مجھ پر موت آجائے، اور ہر آدمی فنا پذیر ہے - اگرچہ اُس کو اُمید نے دھوکہ دے رکھا ہو -

۸. میں قیس اور عمر دونوں کو اس کے جستجو کی وصیت کرتا ہوں اور یزید کو اُن کے بعد جبلہ کو

وصیت کرتا ہوں۔ (جبل سے مُراد حضرت زید کے بھائی جبلہ بن حارثہ ہیں اور یزید بن کے علاتی بھائی تھے)۔

ایک سال کلب کے چند آدمی حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ آئے۔ یہاں اُنہوں نے زیدؓ کو دیکھا تو پہچان لیا، اُنہوں نے ساتھ چلنے کو کہا ہوگا، حضرت زید نے فرمایا "میری طرف سے یہ پیغام میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔

۱۔ اَحِنُّ الی قومی وان کنتُ نائیاً ۔۔۔ فانی قعیدُ البیتِ عند المشاعرِ
۲۔ فکفّوا من الوجد الذی قد شجاکم ۔۔۔ ولا تعملوا فی الارض نصّ الاباعرِ
۳۔ فانی بحمد اللہ فی خیرِ اُسرَۃٍ ۔۔۔ کِرامِ مُعدٍّ کابراً بعد کابرِ

(ترجمہ)

۱۔ میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں اگرچہ بعید ہوں۔ میں خانہ کعبہ میں مشعر الحرام کے قریب رہتا ہوں
۲۔ پس تم اُس غم سے باز آجاؤ جس نے تم کو غمگین کر رکھا ہے۔ اور اونٹوں کو زمین میں مت ہنکاؤ
۳۔ کیونکہ میں بحمد اللہ بہت اچھے قبیلے میں ہوں جو پشتہا پشت سے معد کے شریف آدمیوں کا قبیلہ ہے

کلبیوں نے جاکر حضرت زید کے والد حارثہ کو اس واقعہ کی پوری اطلاع دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پاس یہ مقیم تھے، آپ کے اور آپ کے اہل خانہ کے حالات بھی سُنائے۔ حارثہ کی چشمِ تمنا جو دیدۂ یعقوب کی طرح ایک "روزن دیوار" ہو کر رہ گئی تھی اُس میں پھر امید وارمان کا نور جھلکنے لگا۔ یہ اور اُن کے بھائی کعب دونوں فدیہ لے کر حضرت رسالتمآب کی خدمتِ بلند مرتبت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "اے عبد المطلب کے فرزند ارجمند۔ اے ہاشم کے نورِ نظر، اے اپنی قوم کے سیّد اعلیٰ ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے معاملہ میں گفتگو کرنے آئے ہیں، آپ اُس کو ہمارے حوالہ کر کے ہم پر احسان کیجئے، اور اُس کا فدیہ قبول فرمائیے"۔ آپ نے پوچھا وہ کون ہے؟" بولے "زید بن حارثہ" ارشاد ہوا "کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟" اُنہوں نے پوچھا "وہ

کیا؟" فرمایا "زید کو بلالو اُسے اختیار دے دو، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو ساتھ چلا جائے۔ اگر مجھ کو ترجیح دے تو میں اُس شخص پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا جو مجھ کو ترجیح دیتا ہے" یہ سب اس پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ زید بن حارثہ کو بلایا گیا۔ آپ نے پوچھا تم انہیں پہچانتے ہو۔ بولے "جی ہاں! یہ میرے باپ ہیں اور یہ میرے چچا ہیں" اس کے بعد آپ نے فرمایا "رہا میں تو تم مجھ کو جانتے ہی ہو۔ اور میرا تمہارے ساتھ جیسا کچھ طرز رہا ہے اس کو بھی جانتے ہو، اب تمہیں اختیار ہے مجھ کو پسند کر و یا ان دونوں کو اختیار کرلو"

حضرت زید سرورِ کونین کی غلامی کا شرف و مجد حاصل کر چکے تھے جس پر دنیا جہاں کی نعمتیں اور آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں، بے تامل بولے "میں ان دونوں کو ترجیح نہیں دیتا میں وہ نہیں ہوں کہ کسی کو آپ پر ترجیح دے سکوں، آپ میرے لئے بمنزلہ والد بھی ہیں اور چچا بھی۔ حارثہ اور ان کے بھائی کعب بولے "زید! افسوس! تم آزادی پر غلامی کو اور اپنے باپ اور چچا پر غیر کو ترجیح دیتے ہو؟ فرمایا "جی ہاں! مجھے اس ذاتِ گرامی میں کچھ ایسی ہی خوبیاں نظر آئی ہیں کہ میں کبھی کسی شخص کو اُن پر ترجیح نہیں دے سکتا" آنحضرت نے حضرت زید کی غیر معمولی وفاداری و اطاعت کوشی کا یہ ولولہ انگیز منظر دیکھا تو فرطِ ترحم و شفقت سے حضرت زید کا ہاتھ پکڑ کر مقام حجر تک تشریف لائے، اور اعلان فرما دیا "اے وہ لوگو جو اس وقت موجود ہو۔ تم سب گواہ رہو کہ زید میرا فرزند ہے، وہ میرا وارث ہوگا، اور میں اُس کا وارث ہوں گا۔ حضرت زید کے والد اور چچا نے یہ دیکھا تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو گئے۔ اور واپس چلے گئے"[1]

اسلام پھر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرقِ مبارک پر ختم رسالت کا تاجِ گوہریں رکھا گیا۔ اور اسلام کا شروع شروع میں غلغلہ بلند ہوا تو حضرت زید بھی دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے بلکہ امام زہری کی روایت ہے ما علمنا احداً اسلم قبل زید بن حارثہ

[1] یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد میں بھی مذکور ہے، مگر ہم نے اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۴ و ۲۲۵ سے لیا ہے۔

دہم کو نہیں معلوم کہ حضرت زید سے پہلے کوئی اور اسلام لایا ہو، لیکن اس میں علماء نے کلام کیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی حضرت خدیجہ۔ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور بچوں میں حضرت علی ہیں۔ اسی طرح غلاموں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے حضرت زید ہیں۔ حضرت حمزہ مسلمان ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے اُن کی مواخات کرادی۔

نکاح | حضرت اُم ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آیا اور کنیز تھیں آپ نے حضرت زید کا نکاح اِن سے کردیا، جن کے بطن سے حضرت اُسامہ بن زید پیدا ہوئے۔

ہجرت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے حضرت زید بھی مدینہ پہنچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حضرت اُسید بن حضیر انصاری کا جو قبیلۂ عبد الاشہل کے معزز رئیس تھے، بھائی بنادیا اور اُن کے رہنے کے لئے ایک مکان مخصوص کردیا۔ یہیں آپ کا نکاح آنحضرتؐ نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب سے کردیا۔ مگر طبائع کی عدم موافقت کے باعث دونوں میں نباہ نہ ہوسکا، مجبوراً حضرت زید نے آپ کو طلاق دیدی۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہئے کہ حضرت زید کا نکاح حضرت زینب کے ساتھ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے اور رائے سے ہوا تھا۔ حضرت زینب اس رشتہ پر رضامند نہیں تھیں۔ لیکن آپ کو حضرت زید بہت عزیز تھے، اس لئے آپ نے چاہا کہ اُن کا نکاح آپ کی پھوپی زاد بہن (زینب) سے ہوجائے جو حسب و نسب میں مرتبۂ بلند رکھنے کے ساتھ حسن و جمال میں بھی ممتاز تھیں۔ حضرت زینب نے حضرت رسالتمآب کے رجحانِ طبع کا احترام کرتے ہوئے زید سے نکاح کرنا منظور تو کرلیا، لیکن یہ ظاہر ہے میاں بیوی کے تعلقات اگر دونوں کے مزاج میں موافقت نہ ہو اس طرح کے رکھ رکھاؤ سے نبھ نہیں سکتے۔ چنانچہ یہی ہوا، دونوں میں آئے دن نااتفاقی رہنے لگی۔ حضرت زید بارگاہ رسالت پناہ میں بیوی

کی تیز زبانی اور عدم موافقت کا شکوہ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ طلاق دے دیں۔ آپ
نے اُن کو ایسا کرنے سے منع فرمایا، اور ارشاد ہوا:۔
امسك علیك زوجك واتق اللہ   تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور خدا سے ڈرو۔
حضور پُرنور کو خیال یہ ہوتا تھا کہ میں نے بہت کچھ کہہ سُن کر تو زینب کو نکاح پر
آمادہ کیا تھا۔ اب اُن کو طلاق مل گئی تو اُنہیں طبعی طور پر اس کا بڑا رنج و ملال ہوگا۔ اور چونکہ
اس نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا دخل تھا۔ اس لئے حضرت زینب کی طلاق
کا خیال کر کے آپ خود بھی یک گونہ انفعال واثر محسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کا جملہ بالا ظاہر کرتا ہے
دونوں میں نااتفاقی بڑھتی گئی یہاں تک کہ بحکم وان خفتم الا یقیما حدود اللہ الآیہ
نوبت طلاق کی آگئی۔ حضور پُرنور رحمۃ للعالمین تھے، آپ کو طبعاً اس کا ملال ہوا۔ اور خصوصاً
حضرت زینب کی دل شکستگی اور خانہ ویرانی کا خیال آپ کو اور بھی تکلیف پہنچاتا تھا۔ اب
آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس کی مکافات کر دیں اور نکاح وطلاق سے جو زخم حضرت زینب
کے دل پر لگا تھا۔ اس کی کوئی تدبیر چارہ گری کریں۔ مکافات کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا
تدبیر ہو سکتی تھی کہ آپ نے خود اُن کو شرف زوجیت بخشنا چاہا۔ حضرت زینب کے
نکاح میں بہت کچھ حکمتیں ہونگی۔ بادی النظر میں تین فائدے تو بالکل عیاں ہیں۔
(۱) اسلام میں غلام رہنے سے کسی کی ذات پر بٹہ نہیں لگ جاتا۔ حضرت زید
غلام تھے مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا نکاح اپنی پھوپی زاد بہن سے کر دیا
(۲) پھر پھوپی زاد بہن جو ایک غلام کی مطلقہ بیوی تھیں، آپ نے اُن سے نکاح
کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، بلکہ پوری بشاشت طبع کے ساتھ نکاح کیا۔
(۳) تیسرا اہم فائدہ جو اس سے حاصل ہوا وہ یہ بتانا تھا کہ "لے پالک" کا حکم اپنے
بیٹے کا سا نہیں ہے اُس کی بیوی اگر مطلقہ ہو جائے تو اُس سے نکاح ہو سکتا ہے۔
پھر اس واقعہ سے جہاں یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں سرکار دو جہاں کی مروت،

رحمت و رافت، اور وضع و پاسداری بھی نمایاں ہوتی ہے کہ محض حضرت زینب کی دل شکستگی کو دور کرنے کے لئے آپ نے اُن سے نکاح کیا۔

چنانچہ انقضاء عدت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کی معرفت خود اپنے نکاح کا پیام حضرت زینب کے پاس بھیجا، وہ خود عاقلہ و فہیمہ تھیں جانتی تھیں کہ میرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ قرآن کی کوئی آیت اُس کے متعلق نازل نہ ہو۔ بولیں "دیکھئے خدا کی طرف سے کیا حکم آتا ہے"، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا	جب زید نے حاجت پوری کر لی تو ہم نے اُن کا نکاح آپ سے کر دیا۔

اسی واقعہ کے سلسلہ میں منافقوں نے جو ناگوار شہرت پیدا کر دی تھی۔ قرآن حکیم نے اُس کے رد میں فرمایا:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ	محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا:۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ[1]	لوگوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو اللہ کے نزدیک یہ زیادہ قرین انصاف ہے۔

---

[1] اس واقعہ کے سلسلہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:۔

اذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰہ	جبکہ آپ نے اُس سے جس پر اللہ نے اور آپ نے انعام کیا تھا (یعنی زید پر) کہا کہ اپنی بیوی کو روکے رہو اور اللہ سے ڈرو، اور تم آپ اپنے نفس میں وہ چیز چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ اسکا زیادہ مستحق ہے کہ اُس سے ڈرا جائے۔

بقیہ صفحہ ۴۵

کارنامے حضرت زید تیراندازی میں یگانۂ روزگار تھے۔ معرکۂ بدر سے غزوۂ موتہ تک تمام اہم اور زبردست معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت عائشہ تو یہاں تک فرماتی ہیں کہ حضرت زید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) متعصب عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو عجیب وغریب رنگ دے کر لکھا ہے۔ اور کسی اور کا کیا ذکر خود بعض علماء تفسیر نے اپنی کتابوں میں ایسی بے سروپا روایتیں بھر دی ہیں جن کے باعث معترضین کو اسلام پر حرف گیری کا موقع ملتا ہے خاص حضرت زینب کے نکاح سے متعلق عام تفسیروں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں حافظ ابن حجر اُن کی نسبت بالکل صفائی سے فرماتے ہیں:۔

ووردت آثار اخری اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها

اس کے علاوہ وہ دوسرے آثار جن کو ابن ابی حاتم وطبری نے بیان کیا ہے اور جن کو بہتیرے مفسرین نے نقل کیا ہے ان کے ساتھ مشغول ہونا مناسب نہیں ہے

نہایت افسوس کی بات ہے، ارباب تفسیر روایتوں کی نقل میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ اور طرفہ یہ کہ آیتوں کو ایسے ایسے معانی پہنائے جاتے ہیں جو ہر ایک روایت پر منطبق ہو جائیں ورنہ یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات بالا میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت میں کسی قسم کی گستاخی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو بھی پیدا ہو سکے۔

تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ

آپ اپنے نفس میں وہ چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا

اس اخفا سے مراد صرف یہ ہے کہ حضور سرور کائنات حضرت زینب کی دل شکستگی کو رفع کرنے کے لئے خود اُن سے نکاح کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ آپ اس کو لوگوں پر اس اندیشہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے کہ قرآن مجید میں اب تک متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا ہے۔ منافقین اب اس خبر کو سنیں گے تو عہد جاہلیت کے خیال کی بناء پر طعن شروع کر دیں گے کوتاہ نظر غیر مسلم مصنفین نے اس واقعہ کو ایک افسانہ کا رنگ دے رکھا ہے حالانکہ اگر وہ ذرا تعصب اور بے جا ضد سے ہٹ کر دیکھیں تو انہیں یہ واضح ہو جائے کہ اس موقعہ پر آنحضرت صلعم کا یہ تردد اور پھر آیت کے نزول کے بعد اُس کا صاف و صریح اعلان کر دینا خود سرور عالم کے نبی برحق اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ غور کیجئے ایک طرف تو آپ حضرت زید سے یہ فرماتے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اللہ سے ڈرو۔ اور دوسری طرف آپ کا عمل یہ ہے کہ حضرت زید بغایت مجبوری طلاق دے دیتے ہیں تو آپ خود نکاح کا پیام اُن کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب سے نکاح کسی تعلق خاطر کی بناء پر تھا یا محض اس لئے کہ آپ ان کی تسلی وتشفی کرنی چاہتے تھے اور یہ بتانا منظور تھا کہ متبنیٰ کا حکم بالکل فرزند کا سا نہیں ہے

جس کسی سریہ (فوج کشی) میں شریک ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُنہی کو سردار بناتے تھے۔ اور اگر حضرت زید آپ کی وفات کے بعد بھی زندہ ہوتے تو حضور پرنور اُن کو ہی اپنا خلیفہ مقرر کرتے[1]۔ چنانچہ سریہ قردہ، سریہ جموم، سریۂ عیص، سریۂ طرف و حسمیٰ ان سب مہمات میں اسلامی لشکر کی قیادت حضرت زید ہی کے سپرد تھی جس کو آپ نے بخوبی سرانجام دیا۔ اور کامیاب و بامراد ہو کر واپس آئے۔

فضائل | حضرت زید کی فضیلت و بزرگی کے لئے یہی بات کیا کچھ کم ہے کہ تمام صحابہ کرام میں صرف حضرت زید کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے بہت زیادہ محبت تھی آپ خانوادۂ نبوت میں بالکل ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص زید کی شان میں گستاخی کا کوئی کلمہ کہہ دیتا تو آپ کو اُس کا بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سی فوج کسی مہم پر روانہ کی اور حضرت اُسامہ بن زید کو اُس کا سردار بنا دیا اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو آنحضرت نے فرمایا "اگر تم اُسامہ کی امارت پر اعتراض کرتے ہو (تو کوئی مضائقہ نہیں) اس سے پہلے اس کے باپ زید بن حارثہ کی سرداری پر بھی تم لوگ اسی قسم کا اعتراض کر چکے ہو۔ قسم خدا کی وہ یقیناً امارت کا سزاوار تھا، اور لوگوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اُس کے بعد یہ (اُسامہ) سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے[2]۔

حضرت زید روئی کی طرح سپید تھے، اور حضرت اُسامہ کا رنگ سیاہ تھا۔ بعض مفسدہ پرداز اس اختلاف رنگ کی بنا پر حضرت اُسامہ کے نسب میں طعن کرتے تھے آنحضرت یہ باتیں سنتے تھے تو ملول ہوتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ گھر میں تشریف لائے تو مسکراتے ہوئے اور اس قدر خوش کہ آپ کا چہرۂ اقدس جگمگا اٹھا تھا۔ اور آتے ہی فرمایا "عائشہ! تمہیں خبر نہیں، ابھی ایک قیافہ شناس آیا تھا جس کا نام مجزز تھا۔

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۶ [2] بخاری باب مناقب زید بن حارثہ

اُس وقت زید بن حارثہ اور اُسامہ دونوں ایک چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے اور اُن کے پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ اس شخص نے دونوں کے پاؤں دیکھتے ہی کہا کہ یہ پاؤں بالکل ایک دوسرے کی مانند ہیں (یعنی ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے)[1]

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زید و اُسامہ کے ساتھ غایت محبت کا ثبوت ملتا ہے کہ اگرچہ قیافہ شناس کی بات اسلام میں حجت نہیں ہے تاہم سرور عالمؐ نے اِس کی زبان سے ایک ایسی بات سُنی جس سے حق کی تصدیق و توثیق ہوتی تھی تو آپؐ اس سے خوش ہوئے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں "ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ حضرت زید کہیں باہر سے مدینہ میں آئے۔ اور میرے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ سرور کائنات یہ سُنتے ہی بیتابانہ اُٹھے۔ یہاں تک کہ آپ نے لباس کا بھی اہتمام نہیں کیا، آپ کی چادر مبارک زمین پر گھسٹ رہی تھی اور جاتے ہی حضرت زید سے معانقہ کیا، اور اُن کو بوسہ دیا۔[2]

حضرت زید کے ساتھ اس درجہ تعلق خاطر رکھنے کی وجہ سے آپ حضرت زید کی اولاد کے ساتھ بھی بیحد شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کے کسی گوشہ میں اپنے کپڑے گھسیٹ رہا ہے۔ عبداللہ بن دینار پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن سے آپ نے فرمایا "دیکھو یہ کون ہے؟ اے کاش یہ میرے پاس آئے" ایک شخص بولا "کیا آپ اسے نہیں جانتے؟ یہ تو محمد اُسامہ کا فرزند ہے"، حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ سُنتے ہی سر جھکا لیا، اور ہاتھوں سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا۔ اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرماتے تو ضرور پسند کرتے۔"[3]

[1] بخاری کتاب الفرائض باب القائف [2] رواہ الترمذی مشکوٰۃ المصابیح باب المصافحہ والمعانقہ [3] بخاری

حضرت اُسامہ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اور حضرت حسنؓ کو پکڑتے اور دونوں کے لئے دعا فرماتے۔

اَللّٰهُمَّ اَحِبَّهُمَا فَاِنِّیْ اُحِبُّهُمَا[۱] اے اللہ تو ان دونوں سے محبت کر کیونکہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں

حضرت اُسامہ تو پھر بھی بیٹے تھے حرملہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حجاج بن ایمن جن کے باپ یعنی ایمن حضرت اسامہ بن زید کے علاتی بھائی تھے۔ اور جو ابھی کمسن ہی تھے، مسجد میں آئے، اور بچوں کی طرح ادھ کچری نماز پڑھنی شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا "نماز لوٹاؤ" پھر جب وہ واپس چلے گئے تو آپ نے پوچھا یہ کون تھے؟" حرملہ نے کہا "یہ حجاج بن ایمن بن اُم ایمن ہیں" حضرت ابن عمرؓ بولے "اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو ضرور اِن سے محبت کرتے"[۲]

حضرت ابنِ عمر فرماتے تھے "بخدا حضرتِ زید افسری کے لائق تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے محبوب تھے۔ پھر یہی ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت اُسامہ کا وظیفہ میرے وظیفہ سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا "اے بیٹے اُسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ، اور اسی طرح اُس کے باپ (زید) تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھے۔[۳]

غزوہ موتہ اور شہادت

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں موتہ کا جو شام کا ایک مقام ہے، غزوہ پیش آیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کے نام ایک خط تحریر فرمایا، اور حضرت حارث بن عمر کو نامہ بری کے لئے مقرر کیا۔ یہ خط لیجا رہے تھے کہ علاقہ بلقاء کا ایک رئیس حکمران جس کا نام شرحبیل بن عمرو اور عیسائی مذہب کا پیرو تھا، اُس نے حارث کو قتل کر دیا۔ قاصد کو قتل کرنے کا رواج کہیں بھی نہیں تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدعہدی پر بڑا غصہ آیا، اور آپ نے تین ہزار

---

[۱] بخاری باب مناقب زید بن حارثہ [۲] ایضاً [۳] اصابہ ج ۲ ص ۳۶

مجاہدین اسلام کی ایک فوج حضرت حارث کا انتقام لینے کے لئے روانہ کی۔ اس لشکر میں حضرت جعفر طیار حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی، اور عبداللہ بن رواحہ جو ایک معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، شریک تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے لشکر کی قیادت کا شرف حضرت زید بن حارثہ کو ہی بخشا۔ لوگوں نے اور خود عبداللہ بن رواحہ نے شکایت کی۔ مگر آپ نے فرمایا "تم جاؤ تمہیں معلوم نہیں کہ خیر کس میں ہے"[1] اور ارشاد ہوا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب، اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ لشکر کے امیر ہوں حضرت زید نے حسب دستور اس غزوہ میں بھی خوب داد شجاعت دی۔ لیکن آخر کار برچھیاں کھا کر شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد علم حضرت جعفر کے دست مبارک میں آیا۔ انہوں نے بھی جوانمردی و بہادری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔ انجام کار وہ بھی شہادت کبریٰ کا جام نوش کر کے خاموش ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کی شہادت کا حال سنا تو بڑا رنج ہوا اور فرمایا۔

اخوائی ومونسائی ومحدثائی[2] یہ دونوں میرے بھائی، میرے مونس اور مجھ سے بات چیت کرنے والے تھے

عمر اور حلیہ | شہادت کے وقت حضرت زید کی عمر پچپن برس کی تھی[3]۔ ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا اور پست قامت تھے[4]

ازدواج | شادیاں مختلف اوقات میں متعدد کی تھیں۔ بیویوں کے نام یہ ہیں:۔

ام ایمن، کلثوم بنت عقبہ، درۃ بنت لہب، ہند بنت العوام، زینب بنت جحش

اولاد | دو لڑکے اسامہ بن زید، اور زید بن زید تھے، اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام رقیہ تھا، حضرت اسامہ کے علاوہ دونوں بچے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے[5]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۳ ص ۱۰۹ [2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۷ [3] اصابہ جلد ۳ ص ۲۶ [4] اسد الغابہ ذکر زید بن حارثہ

[5] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۳۰

حضرت عمار بن یاسر

نام و نسب عمار نام ابو الیقضان کنیت والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے "عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن الوذیم بن ثعلبہ بن عوف بن حارثہ ابن عامر الاکبر بن یام بن عنس بن مالک بن ادد بن زید بن یشجب المذحجی ثم العنسی[1]۔

ان کے والد یاسر قحطانی النسل تھے۔ یمن ان کا اصل وطن تھا۔ اپنے دو بھائی حارث اور مالک کے ساتھ ایک گم شدہ بھائی کی جستجو میں مکہ پہنچے، وہ دونوں واپس لوٹ گئے حضرت یاسر یہیں مقیم ہو گئے اور بنو مخزوم کے حلیف ہو کر اس قبیلہ کے ایک شخص ابو حذیفہ بن المغیرہ کی جاریہ سمیہ سے شادی کر لی۔ انہیں کے بطن سے حضرت عمار پیدا ہوئے۔ ماں کی وجہ سے یہ بھی غلام سمجھے جاتے تھے۔ ابو حذیفہ نے ان کو بچپن میں ہی آزاد کر دیا تھا[2]۔ اس بنا پر بنو مخزوم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔

اسلام حضرت عمار بن یاسر اسلام قبول کرنے کی سعادت و شرف کے اعتبار سے السابقون الاولون میں سے ہیں۔ یہ اور حضرت صہیب دونوں ساتھ ایمان لائے تھے وہ خود فرماتے ہیں "کہ میں نے صہیب کو ارقم بن ابی ارقم کے دروازۂ مکان پر دیکھا تو پوچھا "آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟ بولے "پہلے تم اپنا مقصد ظاہر کرو" میں نے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل کر ان کی کچھ باتیں سننی چاہتا ہوں" کہنے لگے "میرا مقصد بھی یہی ہے" اس کے بعد دونوں ساتھ چلے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمار جس وقت اسلام لائے تھے اُس وقت تک حضرت ابوبکر صدیق کے علاوہ صرف پانچ غلاموں اور دو عورتوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت مجاہد کی روایت ہے کہ اس

[1] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳
[2] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳-۴۴
[3] اُسد الغابہ

وقت تک صرف سات اصحاب نے ہی اسلام قبول کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ کچھ اوپر
بیس[۱] لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے[۱]۔

تکالیف و مصائب

اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ خود دنیوی وجاہت و ثروت نہیں رکھتے تھے اور اُس وقت تک اُن کی والدہ سمیّہ بھی بنو مخزوم کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئی تھیں اور اسلام کا جلوۂ جہاں فروز کچھ اس طرح اس خاندان کو منور کر چکا تھا کہ حضرت عمار کے علاوہ ان کی والدہ اور والد بھی مشرف باسلام ہو چکے تھے اس بنا پر کفار ان پر سخت سے سخت مظالم کرتے تھے۔ جلتے ہوئے ریت پر لٹا دیتے اور بری طرح زدوکوب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان تینوں کو ستایا جا رہا تھا کہ حضرت سرورِ عالم کا اُدھر سے گذر ہوا۔ اپنے شیدائیوں کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا اور فرمایا۔
اے آل یاسر تم صبر کرو۔ تمہارا ٹھکانا جنت ہے[۲]۔

حضرت سمیہ کی شہادت

آپ کی والدہ سمیّہ کے ساتھ بدبخت ابوجہل نے انتہا درجہ کا وحشیانہ معاملہ کیا جس کی وہ تاب نہ لاسکیں اور جاں بحق ہوگئیں۔ ان کو اسلام کی راہ میں اس طرح شہید ہو جانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ابوجہل غزوۂ بدر میں مارا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار سے فرمایا" اللہ نے تمہاری ماں کے قاتل کو قتل کر دیا"۔
ابن قتیبہ کو دھوکا ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ حضرت یاسر کے بعد سمیّہ کا نکاح ایک شخص ازرق نامی سے ہوگیا تھا۔ یہ سمیّہ حضرت عمار کی نہیں بلکہ زیاد کی والدہ ہے[۳]۔

ایک مرتبہ مشرکین نے حضرتِ عمار کو پانی میں اس قدر غوطے دئے کہ وہ بالکل بدحواس ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان ظالموں نے ان کی زبان سے ایک ناشائستہ کلمہ بھی کہلوا لیا، اس وقت تو انہیں مصیبت سے نجات مل گئی، مگر بعد میں ہوش آیا تو غایت ندامت و خجالت کے ساتھ بارگاہِ رسالت پناہ میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال

[۱] اُسد الغابہ [۲] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۳ [۳] اصابہ ج ۸ ص ۱۱۴۔

دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے" انہوں نے پورا واقعہ اول سے آخر تک کہہ سنایا، آپ نے فرمایا "تم اپنا دل کیسا پاتے ہو" کہا "میرا دل ایمان پر مطمئن ہے" سرکار دوجہاںؐ نے غایت شفقت کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے، اور فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں" اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:-

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ[1]

(جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اُس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (اُس سے باز پرس نہ ہوگی)

سعید بن جبیر کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس سے دریافت کیا "کیا مشرکین مسلمانوں کو اس قدر اذیتیں پہنچاتے تھے کہ اگر وہ ان کی تاب نہ لاکر دین چھوڑ دیتے تو اُنہیں معذور سمجھا جاتا" فرمایا "ہاں! بخدا یہ لوگ ان غریبوں کو مارتے تھے ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ درد و کرب کے مارے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی عاجز ہو جاتے تھے۔ اور بعض تو مجبور ہو کر مشرکین کے منشاء کے مطابق نادرست باتوں کا اظہار اپنی زبان سے کر بیٹھتے تھے[2]

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو کچھ فرمایا بعینہٖ حضرت عمار پر صادق آتا ہے۔ اُنہوں نے اسلام کی راہ میں طرح طرح کی سخت اور ناقابل برداشت مصائب اُٹھائے، لیکن زبان سے لغزش ہو جانے کے باوجود اُن کا دل برابر صبر و استقامت کے ساتھ ایمان پر مطمئن رہا یہاں تک کہ اُن کی تسلی اور معاملہ کی صفائی کے لئے قرآن مجید کی ایک آیت نازل ہوئی

ہجرت | بعضوں کا خیال ہے کہ حضرت عمار اُن لوگوں میں سے تھے جو آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مگر بعض اس سے مختلف ہیں۔ مدینہ کی ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت عمار بھی روانہ ہوئے اور اس سرزمین قدس میں پہنچ کر حضرت

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عمار و اُسد الغابہ [2] اُسد الغابہ جلد ۴ ص ۴۴ و ۴۵

بشیر بن عبد المنذر کے مہمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اُن کی مواخات حضرت حذیفہ بن الیمان انصاری سے کرادی، اور مستقل سکونت کے لئے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا[1]۔

تعمیر مسجد قبا | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہونچے تو حضرت عمار نے خیال کیا کہ سید عالم کے لئے ایک مکان سے چارہ نہیں ہے کہ جب آپ اپنے قیلولہ سے فارغ ہوکر اُٹھیں تو اُس کے سایہ میں تشریف فرما ہوں، اور وہاں نماز پڑھیں، چنانچہ آپ نے پتھر جمع کئے، اور مسجد قبا کی تعمیر کی یہ مدینہ کی سب سے پہلی مسجد تھی جو حضرت عمار کے ہاتھ سے انجام کو پہنچی[2]۔

تعمیر مسجد نبوی | ہجرت کے چھ سات ماہ بعد مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی گئی تو حضرت عمار نے اس میں بھی حصہ لیا۔ آپ اینٹ گارا لا لاکر دیتے تھے اور زبان پر یہ رجز جاری تھا۔

نحن المسلمون نبنی المساجد — ہم مسلمان ہیں، ہم مسجد بناتے ہیں۔

سب لوگ ایک ایک اینٹ اُٹھاتے تھے، اور حضرت عمار دو دو اینٹ لاتے تھے ایک دفعہ اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرے تو آپ نے ان سے ازراہِ شفقت فرمایا "اے عمار، سنو تم کو باغی فرقہ قتل کریگا، اور تم اہل جنت میں سے ہو[3]"

ایک مرتبہ کسی نے ان پر اتنا بوجھ لاد دیا کہ لوگوں کو خیال ہوا آج عمار نہ بچینگے وہ اس سے پہلے بھی تکلیف شاقہ کی شکایت کر چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر کچھ اینٹیں اُتار کر پھینک دیں اور ارشاد ہوا "افسوس! ابن سمیہ تمھیں گروہِ باغی قتل کریگا"۔

غزوات کی شرکت | حضرت عمار شروع سے بڑے پُرجوش اور بہادر مسلمان تھے۔ غزوۂ بدر سے غزوۂ تبوک تک جتنے معرکے پیش آئے، پوری بہادری اور دلیری کے ساتھ سرورِ کائنات کے ہم رکاب رہے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں جو جنگیں ہوئیں اُن

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۸۹۔ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۵۔ [3] مستدرک ج ۳ ص ۳۸۷۔

میں سے اکثر میں شریک رہے۔ یمامہ کی جنگ میں اُن کا ایک کان شہید ہوگیا جو پاس ہی زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس زور سے پے بہ پے حملے کرتے رہے کہ جس کسی طرف کا رُخ کیا صفیں کی صفیں اُلٹ گئیں۔ ایک دفعہ کچھ لوگ دل شکستہ ہو کر اقدام سے جی چرانے لگے انہوں نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر زور سے کہا "اے مسلمانوں کے گروہ! کیا تم جنت سے بھاگتے ہو، میں عمار بن یاسر ہوں کیا تم جنت سے گریز کرتے ہو۔ دیکھو! میں عمار بن یاسر ہوں۔ آؤ، میری طرف۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "عمار یہ کہتے جاتے تھے اور میں اُن کے کان کو دیکھ رہا تھا" کہ لٹکا ہوا تھا" اور وہ بڑے زور سے حملے کرتے تھے[1]۔

کوفہ کی گورنری حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اُن کو حضرت عبداللہ ابن مسعود کے ہمراہ کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس موقعہ پر آپ نے جو فرمان اہل کوفہ کے نام ارسال کیا تھا ہم اُس کو ذیل میں بعینہٖ نقل کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اجلۂ صحابہ صاحب علم و فضل آزاد کردہ غلاموں کی کتنی توقیر کرتے تھے، تحریر فرماتے ہیں۔

اما بعد فانی بعثت الیکم عمار بن	اما بعد میں عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود کو
یاسر امیرا و عبداللہ بن مسعود معلما	وزیر و معلم بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں ابن مسعود
و وزیرا وقد جعلت ابن مسعود علی	تمہارے بیت المال کے منتظم ہونگے۔ یہ دونوں محمدؐ
بیت مالکم وانھما لمن النجباء من	کے شریف ساتھیوں میں سے ہیں اور غزوۂ بدر میں
اصحاب محمد من اھل بدر فاسمعوا	شرکت کی سعادت رکھنے والے ہیں، تم سب ان
لھما واطیعوا واقتدوا بھما وقد اثرتکم	کا کہا مانو، اطاعت کرو اور ان دونوں کی پیروی کرو
بابن ام عبد علی نفسی وبعثت عثمان	میں نے ام عبد کے بیٹے (عبداللہ بن مسعود) کو تمہارے
ابن حنیف علی السواد ورزقھم کل	پاس بھیج کر تم کو خود اپنے نفس پر ترجیح دی ہے، اور

[1] مستدرک ج ۳ ص ۳۸۷۔

یوم شاۃ فاجعل شطرھا وبطنھا لعمار والشطر الباقی بین ھؤلاء الثلاثۃ[1]	اور عثمان بن حنیف کو ارض سواد کی پیمائش کے لئے بھیجتا ہوں۔ ان کی خوراک کے لئے ایک بکری یومیہ مقرر کی جاتی ہے جس کا ایک حصہ اور پیٹ عمار کو ملیگا اور بقیہ حصے ان تینوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

حضرتِ عمار نے ایک سال نو ماہ تک فرائض امارت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے لیکن کوفہ کے لوگ انتہا درجہ کے تندمزاج اور متلون واقع ہوئے تھے۔ کسی ایک امیر کی اطاعت پر قائم رہتے ہی نہ تھے عمار سے قبل یہاں کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ ان کی اہلیت و قابلیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر کوفہ والوں نے حسب عادت ان کی اتنی شکایتیں دربار خلافت تک پہنچائیں کہ آخر کار انہیں معزول کرنا پڑا۔ حضرت سعد کے بعد جب عمار گورنر ہو کر آئے، تو ان کے ساتھ بھی اُن لوگوں نے یہی معاملہ کیا، اور حضرت عمر فاروق کے پاس بار بار لکھ کر بھیجا کہ "عمار کمزور ہیں، انہیں سیاست نہیں آتی" خلیفۂ دوم کو اہل کوفہ کی اس تلون مزاجی پر بڑا افسوس ہوا، اور آپ نے فرمایا:۔

من عذیری من اھل الکوفۃ۔ ان استعملت علیھم القوی فجروہ وان ولّیتُ علیھم الضعیف حقّروہ[2]	اہل کوفہ کی طرف سے مجھ کو معذور رکھنے والا کون ہے۔ اگر میں اُن پر قوی کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اُس سے انحراف کرتے ہیں، اور اگر ضعیف کو اُن پر حاکم مقرر کرتا ہوں تو یہ اُس کی تحقیر کرتے ہیں۔

بہر حال حضرتِ عمرؓ نے ان کو معزول کر کے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

معزولی کے بعد حضرت عمرؓ نے اُن سے پوچھا "تم معزولی کے حکم سے ناراض تو

---

[1] یہ فرمان اختصار کے ساتھ "اُسد الغابہ" میں بھی ہے، مگر اس تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد جزء ۳ ص ۱۸۱ میں مذکور ہے۔ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷۸ –

نہیں ہوئے؟ بولے "میں اس امارت سے خوش تھا اور نہ اب عزل سے خوش ہوں"[1]

خلیفہ ثالث کے عہد میں حضرت عمار خوش نہیں رہے۔ ایک تحقیقات کے سلسلہ میں مصر بھیجے گئے تھے، ایک عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آئے، تو اُن پر اہلِ مصر کے خیالات کا گہرا اثر تھا۔

خلیفہ چہارم کے عہد میں

حضرتِ عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو اُنہوں نے حضرت عمارؓ کو تمام اہم امور میں اپنا مشیر کار مقرر کر لیا۔ حضرت عائشہؓ حضرتِ زبیرؓ اور حضرتِ طلحہؓ وغیرہ نے حضرتِ عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں جنگی تیاریوں کے لئے بصرہ کا رُخ کیا تو حضرت علی کے حکم سے آپ حضرت امام حسن کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے کہ اہل کوفہ کو خلافت کے تحفظ و حمایت پر آمادہ کریں۔

جنگ جمل

ماہ جمادی الاُخریٰ ۳۶ھ میں جمل کی ناگوار جنگ پیش آئی تو حضرت عمار حضرت علی کے ساتھی تھے اور فوج کے میسرہ کی قیادت کرتے تھے۔ اِس جنگ میں بھی حسب معمول حضرت عمار نے غیر معمولی جرأت و دلیری اور شجاعت و مردانگی کا ثبوت دیا۔

جنگ صفین

اس کے بعد امیر معاویہ سے صفین کا معرکہ پیش آیا اس وقت حضرت عمار کی عمر اکیانوے برس کی تھی، مگر حوصلہ اور ہمت جوانوں سے بڑھ کر تھی۔ نہایت جوش وخروش سے حضرت علیؓ کی جانب سے لڑ رہے تھے۔ اثنائے جنگ میں اِن کی نظر حضرت عمرو بن العاص پر پڑ گئی جو حضرت امیر معاویہ کے بڑے سرگرم علمبردار تھے۔ حضرت عمار نے ان کو دیکھ کر فرمایا: "میں اس علمبردار سے تین دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں لڑ چکا ہوں۔ اب یہ چوتھی مرتبہ ہے۔ بخدا اگر وہ ہم کو شکست دیتے ہوئے مقام ہجر تک بھی پسپا کرتے چلے آئیں میں تب بھی یہی سمجھوں گا کہ ہم لوگ حق پر ہیں اور وہ غلطی پر"[2]

شہادت

اسی جنگ میں ایک دن حضرت عمار نے ایک گھونٹ مانگا، تھوڑا سا دودھ

---

[1] اُسد الغابہ تذکرۂ حضرت عمار۔ [2] طبقات ابن سعد جز ۳ ص ۱۰۵۔

حاضر کیا گیا۔ آپ نے اُس کو دیکھ کر فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا آخری گھونٹ جو تم پیوگے وہ دودھ کا ہوگا۔ یہ کہہ کر میدان جنگ میں جا گھسے اور اس بے جگری سے لڑے کہ آخر کار قتل کر دئے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۴ سال کی اور بعض کے نزدیک ترانوے برس کی تھی۔[1]

فضائل حضرت عمار کی کتاب فضائل کا سب سے زیادہ روشن باب یہ ہے کہ وہ حق کی تائید میں کسی شخص کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ جنگ جمل کا معاملہ نہایت سخت تھا۔ ایک طرف اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ تھیں، اور دوسری طرف حیدر کرار علی مرتضیٰ تھے دونوں نہایت درجہ محترم و مکرم اور خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے والے۔ حضرت عمار غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس جنگ میں حضرت علی کی حمایت کرنی چاہئے چنانچہ آپ مردانہ وار مقابلہ کے لئے بڑھے، اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معرکہ آرائی کی۔

اس موقع پر حضرت ابوموسیٰ اشعری ایسے بزرگان مرنج و مرنجاں نے لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کی۔ مگر حضرت عمار نے ایک پرجوش تقریر میں فرمایا "لوگو! میں جانتا ہوں عائشہ دنیا اور آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں لیکن اس وقت خدا تم سب کا امتحان لے رہا ہے کہ تم اُس کی فرمانبرداری کرتے ہو یا حضرت عائشہ کی؟"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی وصف خاص کی بنا پر حضرت عمار سے محبت کرتے اور اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضرت علی فرماتے ہیں "ایک دفعہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت عمار آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مرحبا بالطیب المطیب — خوش آمدید! پاکیزہ و مصفا بزرگ۔

---

[1] الاخبار الطوال دینوری ص ۱۴۷۔

ایک دفعہ حضرت خالد اور حضرت عمار دونوں میں کسی بات پر نزاع ہو گیا جس میں اول الذکر نے اپنے حریف کی شان میں کوئی نامناسب کلمہ کہہ دیا۔ آنحضرت صلعم کو اس کی خبر ہوئی تو حضرت خالد پر ناراض ہوئے اور فرمایا:-

یاخالد لاتسب عماراً فانہ من یسبّ عماراً یسبہ اللہ ومن یبغض عماراً یبغضہ اللہ ومن یسفہ عماراً یسفھہ اللہ

اے خالد عمار کو بُرا نہ کہو جو اُس کو بُرا کہتا ہے اللہ اس کو سبکرتا ہے۔ جو عمار کو مبغوض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہوتا ہے اور جو عمار کی تحمیق کرتا ہے۔ اللہ اسکی تحمیق کرتا ہے

حضرت خالد فرماتے ہیں "یہ دن میرے لئے بڑا ہی سخت تھا، اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے استغفار کیجئے۔ اور خود بھی حضرت عمار سے عفو کے طلبگار ہوئے[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "اگر عمار کو دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ اُسی بات کو اختیار کرینگے جو بہتر ہوگی"۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا "لوگو! میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتداء کرو اور عمار کی روش سیکھو۔ چنانچہ لوگ عام طور پر یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عمار جدھر ہونگے حق اسی طرف ہوگا۔ خزیمہ بن ثابت جنگ جمل و صفین میں موجود تھے۔ لیکن اُنہوں نے اپنی تلوار میان سے نہیں نکالی۔ لوگوں نے پوچھا تو کہا دیں اپنی تلوار اُس وقت تک نہیں کھینچونگا جب تک کہ میں یہ نہ دیکھ لوں کہ عمار کو کون قتل کرتا ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ نے حضرت عمار سے فرمایا، تم کو باغیوں کا گروہ قتل کریگا"۔ پھر جب صفین میں عمار قتل کردئے گئے تو خزیمہ نے کہا کہ "قاتل عمار کے لئے گمراہی یقینی ہے"۔

عمرو بن العاص صفین میں حضرت معاویہ کی فوج کے علمبردار تھے۔ لیکن وہ بھی حضرت عمار کی جلالتِ شان کے اس درجہ معترف تھے کہ عمار کے شہید ہو جانے کے بعد

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۱ و ۳۹۲۔

اُن کے دو قاتل لڑتے جھگڑتے حضرت عمرو بن العاص کے پاس آئے اور اُن میں سے ہر ایک نے کہا کہ میں نے عمار کو قتل کیا ہے۔ تو حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا "قسم اللہ کی یہ دونوں دوزخ کے لئے جھگڑ رہے ہیں۔ قسم اللہ کی میں پسند کرتا ہوں کہ اب سے بیس برس پہلے مرگیا ہوتا۔[1]

مذہبیت ایک زبردست مجاہد و سرفروش ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمار سجدہ نمازی اور اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں "یہ آیت۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ

(کیا وہ شخص جو رات کو سجدہ کر کر کے اور قیام کر کے عبادت کرتا ہے، آخرت کے ڈر سے اور اپنے رب کی رحمت کی امید کرتا ہے (گنہگار بندوں کی برابر نہیں ہوسکتا)

حضرت عمار کی شان میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جمعہ کے دن خطبہ سے قبل منبر پر بیٹھ کر عموماً سورۂ یٰسٓ تلاوت فرماتے تھے۔ خطبہ فصیح و بلیغ اور مختصر ہوتا تھا۔ ایک بار کسی نے اس اختصار پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "نماز کو طول دینا اور خطبہ مختصر کرنا انسان کے سمجھ کی نشانی ہے۔"

حلیہ — قد دراز، آنکھیں نرگسی، سینہ چوڑا، رنگ سیاہ، بدن بھرا اور گٹھا ہوا، سر کے بال بہت کم۔ اکیانوے یا کچھ اس سے زائد برس کی عمر میں شہادت پائی، مگر آخر تک جوانوں کی طرح باہمت و باحوصلہ رہے، کبھی خضاب استعمال نہیں کیا۔[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۶ [2] اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۷

حضرتِ سالم

نام و نسب | ابو عبداللہ کنیت، سالم نام، والد کا نام بعض کے نزدیک عبید بن ربیعہ اور بعض کے نزدیک معقل ہے۔ ایرانی الاصل ہیں۔ اصطخر ان کا آبائی وطن تھا۔ مولیٰ ابی حذیفہ بن عتبہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ دراصل حضرت ابو حذیفہ کی بیوی ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے غلام تھے۔ اُنھوں نے آزاد کر دیا تو حضرت ابو حذیفہ نے اُن کو اپنا بیٹا بنا لیا[1] اور اپنی بھتیجی فاطمہ بنتِ ولید سے اُن کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ لوگ اُنھیں سالم بن حذیفہ کہنے لگے، مگر جب قرآن مجید میں "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ" (اُن کو اُن کے باپ کی نسبت سے بلایا کرو) کا حکم نازل ہوا تو لوگ اُنھیں سالم مولیٰ ابی حذیفہ کہنے لگے[2]۔

اسلام | مکہ میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو حضرت سالم ابو حذیفہ کے ساتھ یہیں مقیم تھے توحید کی دعوتِ ربانی نے اپنا اثر کیا اور فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبیدۃ بن الجراح سے بھائی چارہ کرا دیا[3]۔ مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے مدینہ پہنچ گئے۔ سرور کونین نے مدینہ پہنچ کر معاذ بن ماعص سے مواخات کرا دی[4]۔

غزوات و شہادت | حضرت سالم نہایت پُرجوش اور بہادر مجاہد تھے، غزوۂ بدر، اُحد اور تمام اہم معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں مرتدین سے یمامہ میں جنگ کی نوبت آئی، تو حضرتِ سالم اس میں شریک تھے۔ آپ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا کسی نے کہا "آپ یہ جھنڈا کسی اور کو دیدیجیے، آپ کی جان کا خطرہ ہے" بولے "تو پھر میں بُرا حاملِ قرآن ہونگا" نہ مانے اور جھنڈا لے کر میدان جنگ میں درّانہ گھُسے چلے گئے، داہنا ہاتھ کٹ گیا تو بائیں

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۵ [2] اصابہ ج ۳ ص ۵۲ [3] طبقات ابن سعد جزء ۳ ص ۶۱ [4] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۶

ہاتھ سے علم تھام لیا، بایاں ہاتھ بھی قلم ہوگیا تو لواء کو گردن میں ڈال لیا کہ وہ خم نہ ہونے پائے۔ آپ جھنڈے کو سینہ سے چمٹائے اور گردن سے لگائے ہوئے تھے اور زبان مبارک پر یہ فقرہ جاری تھا:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ

محمد صرف ایک رسول ہیں اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والے قتل کئے گئے

اس حالت میں کب تک مقاومت کرتے؟ زخموں سے چور ہو کر گرے تو پوچھا "ابوحذیفہ کا کیا حال ہے؟" کسی نے کہا "وہ تو قتل کردیے گئے" پھر کسی شخص کا نام لے کر دریافت کیا اُس کا کیا حال ہے؟" لوگوں نے کہا "وہ بھی قتل کردے گئے" فرمایا "مجھ کو ان دونوں کے درمیان لٹا دو۔

ابن سعد فرماتے ہیں "جنگ یمامہ میں مسلمانوں کے پاؤں پیچھے پڑنے لگے تو حضرت سالم نے فرمایا "حیف! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو ہمارا حال ایسا نہ تھا" یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے لئے ایک گڑھا کھود لیا اور اُس میں کھڑے ہو کر علم لئے ہوئے آخر لمحۂ حیات تک لڑتے رہے۔ جنگ کے ختم پر لوگوں نے دیکھا کہ اُن کا سر اپنے منہ بولے باپ حضرت ابوحذیفہ کے پاؤں پر تھا[۱]۔

شہید ہونے کے بعد دیکھا گیا تو اُن کا ترکہ صرف ایک ہتھیار اور ایک گھوڑا تھا۔ حضرت عمر نے اُس کو ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے پاس بھیج دیا۔ اُنہوں نے اُس کو قبول نہیں کیا، اور کہا کہ "حضرت سالم کو آزاد کرنے والی تو سائبہ ہیں۔ حضرت سائبہ کے پاس یہ ترکہ بھیجا گیا تو اُنہوں نے فرمایا "میں نے سالم کو محض اللہ کے لئے آزاد کیا تھا۔ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے" حضرت عمر نے اس کے بعد اس تمام ترکہ کو بیت المال میں داخل کر دیا[۲]۔

---

[۱] طبقات ابن سعد قسم اول جزو ۳ ص ۶۱ [۲] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲٦ -

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سالم کی شہادت کی خبر پھیلی تو لوگوں نے کہا "آج ایک ربع قرآن جاتا رہا"[1]

فضائل | حضرتِ سالم صحابہ کرام کے طبقہ سابقون الاولون میں سے سمجھے جاتے تھے قرأت اور حسن صوت کے امام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے قرأت چار شخصوں سے حاصل کرو، عبداللہ بن مسعود، سالم مولی ابی حذیفہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "جب سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سُنا ہے میں حضرتِ سالم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں"[2]۔ خوش الحانی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کے پاس تشریف لا رہی تھیں راستہ میں رُک گئیں۔ سرورِ کونین نے وجہ دریافت کی۔ فرمایا، ایک شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا میں اُس کو سُننے لگی" آنحضرتؐ کو یہ سُن کر اتنا اشتیاق ہوا کہ فوراً ردائے مبارک سنبھالتے ہوئے باہر تشریف لائے اور جب دیکھا کہ یہ قاری حضرت سالم تھے تو زبانِ قدس یوں زمزمہ پیرا ہوئی۔

الحمدُ للهِ الّذِی جَعَلَ فِی اُمَّتِی مِثلَکَ[3]	جمیع حمد ثابت ہے اُس خدا کے لئے جس نے میری اُمت میں تمہارے جیسے لوگوں کو پیدا کیا۔

حضرتِ سالم کے لئے اس سے بڑھ کر فضیلت و بزرگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود نبوت کی زبان حق ترجمان اُس پر فخر و ناز کرے۔

مدینہ میں امامت | اِسی خوش الحانی اور فنِ قرأت میں مہارت و امامت کے باعث آپ مسجد قباء میں نماز پڑھاتے تھے۔ اور اجلّۂ صحابہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ آپ کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے[4]۔ حضرت سالم کے اس فضل و کمال کی وجہ سے تمام صحابہ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حضرتِ عمرؓ نے وفات کے وقت فرمایا "اگر آج سالم زندہ

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۶۔ [2] بخاری باب مناقب سالم مولی ابو حذیفہ۔ [3] اُسد الغابہ تذکرہ سالم۔

[4] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب امامۃ العبد

ہونے تو میں خلافت کی سفارش اُن کے لئے کرتا[1]

حضرت اسلم فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا "تم لوگ تمنا کرو" کسی نے کہا "میں اس بات کی تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر سونے سے بھرا ہوتا، اور میں اُس سب کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتا، اور صدقہ دے ڈالتا، ایک دوسرے شخص نے کہا "اے کاش یہ گھر پکھراج اور جواہرات سے پُر ہوتا اور میں فی سبیل اللہ وہ سب لٹا بیٹھتا" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اور کوئی تمنا ظاہر کرو" لوگوں نے کہا "ہم نہیں جانتے اے امیر المومنین کیا کہیں۔ پھر آپ نے فرمایا میں تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن الجراح معاذ بن جبل، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، اور حذیفہ بن الیمان ایسے بزرگوں سے بھرا ہوتا[2]۔

اخلاق حضرت سالم اخلاق کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ بزرگ تھے گذشتہ واقعات زندگی سے ان کی استقامت اور استقلال و پامردی کا ثبوت ملتا ہے دنیا و اہل دنیا سے بے تعلق رہتے تھے، جو کچھ کماتے تھے مختلف اسلامی ضرورتوں اور غلاموں کی ضرورتوں پر صرف کر دیتے تھے۔ وفات کے وقت صرف ایک ہتھیار اور ایک گھوڑا چھوڑا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۶ و ۲۴۷ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۶ ۔

حضرت ثوبانؓ

والد کا نام حجدر یا بجدد تھا، کنیت ابو عبداللہ، اور نام ثوبان، یمن کے باشندے تھے، پہلے غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزاد کر دیا، اور فرمایا "اگر تم اپنے خاندان میں جانا چاہتے ہو تو وہاں چلے جاؤ اور اگر یہاں قیام کرنا پسند کرو تو تم میرے اہلِ بیت میں سے ہو" انہوں نے بارگاہِ نبوی میں رہنا ہی اختیار فرمایا اور سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے[۱]۔

ایک مرتبہ آپ نے اہلِ بیت کے لئے دُعا کی، حضرت ثوبان بولے "انا من اھل البیت" (میں بھی اہل بیت میں سے ہوں؟) حضرت نے فرمایا "ہاں! جب تک تم کسی دروازہ کی چوکھٹ پر نہ کھڑے ہو یا کسی امیر کے پاس سوال کرنے نہ جاؤ[۲]۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے، حضرت ثوبان جلوت و خلوت میں آپ کے ساتھ رہے، وفات کے بعد کچھ دنوں تک مدینہ میں ہی قیام رہا، پھر رملہ (شام) میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

حضرت ثوبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شرف غلامی حاصل تھا وہ اس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حمص میں بیمار ہو گئے اور وہاں کا گورنر آپ کی عیادت کے لئے نہ آیا تو آپ نے اُس کو لکھا "اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا غلام تمہارے یہاں ہوتا تو کیا تم اُس کی عیادت کے لئے نہ آتے؟ گورنر حضرت ثوبان کے ان الفاظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکلا اور آپ کے گھر آکر دیر تک مزاج پرسی کرتا رہا[۳]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱ [۲] اصابہ جلد ا ص ۲۱۲ [۳] مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۸۰۔

حضرت ثوبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لئے آپ کو احادیث کثرت سے یاد تھیں، اور پھر حفظ حدیث کے ساتھ وہ اس کی اشاعت و تبلیغ کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ اس فضل و کمال کی وجہ سے لوگ آپ سے احادیث سُننے کے مشتاق رہتے تھے ایک بار لوگوں نے اس کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا "جو مسلمان خدا کے لئے ایک سجدہ کرتا ہے۔ خدا اُس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ اور اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے۔[1]

بڑے بڑے علماء اُن سے اپنی مسموعہ احادیث کی تصدیق کراتے تھے۔ معدان بن طلحہ جلیل القدر محدث تھے۔ اُنہوں نے حضرت ابودرداء سے ایک حدیث سُنی تو اُس کی تصدیق حضرت ثوبان سے کی۔[2]

معدان کے علاوہ ابوادریس الخولانی۔ ابو عامر الالہانی، عبد الرحمن بن غنم، جبیر بن نفیر اور دوسرے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔[3]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۷۶ [2] ابو داؤد ج ۱ ص ۳۳۷ [3] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱

حضرت ابو فکیہ

یسار نام، ابو فکیہ کنیت، قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے، صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے[1]۔ دعوتِ اسلام کی صدائے کفر شکن مکہ میں نئی نئی بلند ہوئی تھی کہ آپ مسلمان ہوگئے۔ حضرت بلال اور حضرت صہیب کی طرح ان پر بھی شدید مظالم کئے جاتے تھے۔ آتش خیز دوپہر میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر منہ کے بل لٹا کر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا تھا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابو فکیہ اس ظلم کی تاب نہ لا کر بیہوش ہوجاتے تھے۔ ایک بار اُمیہ نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو جلتی ہوئی ریت پر ڈال دیا اور گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں اس کا بھائی ابی بن خلف ادھر سے گذرا اور کہنے لگا "اور مارو"، چنانچہ اُمیہ برابر مارتا رہا یہاں تک کہ ان کو بے جان سمجھ کر چھوڑ دیا حضرت ابو بکر ادھر سے گذرے، ابو فکیہ کو اس حال میں دیکھ کر جی بھر آیا فوراً ان کو خریدا اور فی سبیل اللہ آزاد کر دیا[2]۔

ہجرت و وفات آزادی کے بعد ہجرت ثانیہ کے موقع پر حبشہ چلے گئے۔ سخت ترین مصائب و آلام برداشت کرنے کی وجہ سے اعضاء میں اضمحلال پیدا ہوگیا تھا زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے اور غزوۂ بدر سے پہلے ہی وفات پاگئے[2]۔

---

[1] اصابہ ج ۷ ص ۱۵۲ [2] طبقات ابن سعد ج ۴ ق اول ص ۹۱

حضرت عامر بن فُہیرہ

نام و نسب | عامر نام، ابو عمرو کنیت، والد کا نام فُہیرہ تھا، طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے جو حضرت عائشہ کے اَخیافی بھائی تھے، اور قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام | مکہ مکرمہ میں اسلام کا غلغلہ اوّل اوّل بلند ہوا تو اُس کی صدائے پُر تاثیر نے جن حق آگاہ دلوں کو متاثر کیا، اُن میں ایک حضرت عامر بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دارِ ارقم میں تشریف فرما نہیں ہوئے تھے کہ حضرتِ عامر بحالتِ غلامی ہی اسلام لے آئے۔ حضرتِ بلال، مصعب بن عمیر اور حضرت عمارؓ کی طرح ان پر بھی سخت سے سخت مصیبتوں کی انتہا کر دی گئی، مگر انہوں نے بڑی پامردی اور استقلال وثابت قدمی کے ساتھ اِن سب کا مقابلہ کیا، اور اسلام کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ حضرت ابو بکر جو غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے میں مشہور ہیں۔ انہوں نے حضرت عامر کی یہ حالت دیکھی تو خرید کر آزاد کر دیا[۱]۔

ہجرت | پھر جب سرکارِ دوعالم یارِ غار حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کی ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور غارِ ثور میں قیام کیا، تو حضرت ابو بکر نے حضرت عامر کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ دِن بھر اُن کی بکریاں چراتے تھے اور شام کو غار کے پاس لے آتے یہاں دُوہ کر اُن کا دودھ نکالا جاتا اور کام میں لایا جاتا۔ صبح کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی بکر واپس جاتے تو بکریوں کو اُن کے نشانِ قدم پر لے چلتے کہ مشرکین کو کچھ شبہ نہ ہو۔ پھر جب یہ قافلہ غارِ ثور سے روانہ ہوا تو حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت سعد بن خثیمہ کے مہمان ہوئے اور حضرت حارث بن اوس کے ساتھ مواخات کرا دی گئی[۲]۔

مدینہ کی آب وہوا شروع میں جن حضرات کو موافق نہیں آئی اُن میں ایک حضرت

---

[۱] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۹۰۔ [۲] اُسد الغابہ ج ۳ صفحہ ۹۰۔

عامر بھی تھے - مرض کا اس قدر غلبہ ہوا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے، بحران کی شدت کے وقت یہ اشعار پڑھتے تھے -

انی وجدتُ الموت قبل ذوقہٖ ان الجبانَ حتفہ من فوقہٖ

کل امرءٍ مجاھدٌ بطوقہٖ کالثور یحمی انفہٗ بروقہٖ

ترجمہ :- میں نے موت سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا - بے شبہ بزدل کی موت اس کے اوپر سے ہے -

ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے، بیل کی طرح جو اپنے سینگ سے اپنی ناک کی حفاظت کرتا ہے ؎

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین کرامؓ کی اس ناسازیٔ طبائع کی خبر ہوئی تو آپ نے دعا کی "اے خدا! تو مکہ کی طرح مدینہ کو بھی ہمارے لئے خوشگوار بنا دے - اور اُس کو بیماریوں سے پاک و صاف کر دے " دعا قبول ہوئی، اور حضرت عامر بن فہیرہ تندرست ہو گئے غزوات؛ غزوۂ بدر و اُحد میں شریک تھے - صفر ۴ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو برار کلابی جو قبیلۂ کلاب کا سردار تھا، اُس کی درخواست پر ستر قاریوں کی ایک جماعت کو جن میں سے اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے تبلیغ و ارشاد کے لئے اس قبیلہ کی طرف روانہ کیا - ان میں حضرت عامر بن فہیرہ بھی تھے اس جماعت مبلغین نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا - عامر بن طفیل نے رعل و ذکوان قبائل کے پاس آدمی دوڑا دیے، ان لوگوں نے غداری کر کے ان تمام اصحاب کو مع حضرت عامر بن فہیرہ کے شہید کر دیا - صرف حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری زندہ گرفتار ہوئے - حضرت عامر کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی - اس کے بعد عامر بن طفیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو کہا کہ میں نے

ا؎ اصابہ تذکرہ حضرتِ عامر ۲؎ عربی کا مشہور شاعر ہے - اس کا دیوان عبید بن ابرص کے دیوان کے ساتھ یورپ سے شائع ہو چکا ہے -

عامر بن فہیرہ کی لاش کو قتل ہونے کے بعد دیکھا کہ آسمان کی طرف اُٹھائے گئے یہاں تک کہ آسمان وزمین کے درمیان بالکل معلق نظر آئے پھر زمین پر رکھ دیے گئے [1]

حضرت عروہ سے مروی ہے کہ ان شہداء کرام میں حضرت عامر کی نعش تلاش کی گئی تو نہیں ملی۔ اس پر لوگوں کو خیال ہوا کہ فرشتے اس کو اُٹھا کر لے گئے یا انہوں نے تدفین کردی سرور کائنات کو اس واقعہ معونہ کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور آپ چالیس روز تک صبح کی نماز کے بعد ان غداروں کے حق میں بددعا فرماتے رہے، یہاں تک کہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (آپ کو اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے) نازل ہوئی [2]

اخلاق وشمائل | حضرت عامر صورت ظاہری کے لحاظ سے سیاہ فام حبشی تھے مگر اُن کا دل اور سینہ انوارِ نبوت کی عکس ریزیوں سے شمع جہاں فروز کی مانند روشن تھے حضرت عامر کی فضیلت وبزرگی کے لئے یہ شرف ہی کیا کم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو غارِ ثور ایسے نازک موقع پر اپنا معتمد بنایا۔ استقلال وپامردی کا عالم یہ تھا کہ غزوۂ بیر معونہ میں اُن کے قاتل جبار بن سلمی کا نیزہ سینہ سے پار ہوا تو اضطراب وتشویش کی بجائے بے ساختہ زبانِ مبارک سے نکلا "فُزْتُ وَاللّٰهِ" میں اللہ کی قسم کامیاب ہوگیا۔ [3]

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع [2] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۹۱ [3] طبقات ابن سعد ص ۳۳

حضرتِ ابورافع

نام ونسب | نام میں بہت اختلاف ہے، زیادہ مشہور اسلم ہے، امام بخاری نے بھی اس کا ہی جزم کیا ہے ۔کنیت ابورافع تھی۔

غلامی | ابتدا میں حضرت عباس کے غلام تھے۔ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور ہبہ دے دیا۔ آنحضرت صلعم نے حضرتِ عباس کے اسلام قبول کرنے کی خوشی میں آزاد کر دیا[1]

اسلام | اپنے اسلام کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش نے مجھ کو کسی کام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ کو دیکھتے ہی میرا دل اسلام کی طرف مائل ہوگیا اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب میں قریش کے پاس واپس نہ جاؤں گا سرکار کونین صلعم نے فرمایا "میں عہد شکنی نہیں کرتا اور قاصد کو نہیں روکتا۔ اب تو تم واپس چلے جاؤ۔ اگر پھر بھی تم اسلام کی طرف میلان کا جذبہ اپنے اندر پاؤ تو واپس آجانا" چنانچہ ارشاد نبوی صلعم کے مطابق یہ واپس چلے گئے اور پھر بارگاہِ نبوت پناہ میں حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے[2]

اخفاء اسلام | بدر تک قریش کے خوف سے اسلام کا اعلان نہیں کیا، ایک دن چاہِ زمزم پر بیٹھے تیر درست کر رہے تھے۔ حضرتِ عباس کی بیوی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں، اتنے میں ابولہب آیا، اور حجرہ کی طناب کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر ابوسفیان آئے۔ ابوسفیان نے ابولہب سے بدر کے حالات پوچھنے شروع کئے۔ "بولا" کیا بتاؤں، مسلمانوں نے ہماری تمام قوت تباہ کر کے رکھ دی کتنے ہی ہیں جن کو نذرِ تیغ کیا، کچھ گرفتار ہوئے۔ اسی سلسلے میں ایک یہ عجیب وغریب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں زمین سے

---

[1] ابن سعد قسم اول جزء ۴ ص ۵۱۔ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹۸۔

آسمان تک سفید پوش سوار بھرے پڑے تھے۔ ابورافع بولے "وہ فرشتے تھے"۔ یہ سُن کر ابولہب نے اُن کے مُنہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ یہ سنبھل کر گتھم گتھا ہو گئے۔ مگر کمزور تھے غالب نہ آسکے۔ ابولہب نے زمین پر ٹپک دیا اور جتنا مار سکتا تھا مارا۔ حضرتِ عباس کی بیوی جو پاس ہی موجود تھیں، اس ظلم کو برداشت نہ کر سکیں۔ ایک ستون اُٹھا کر اس زور سے رسید کیا کہ ابولہب کا سر کُھل گیا۔ اور بولیں "اس کا آقا موجود نہیں ہے کمزور سمجھ کر مارتا ہے"۔[1]

ہجرت بدر کے بعد ہجرت کر کے مدینہ گئے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام پذیر ہو گئے

غزوات اُحد اور خندق وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ حضرت علی کی زیر سرکردگی جو یمن کی طرف بھیجا تھا، اُس میں حضرت ابورافع بھی تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا "اے ابورافع! تم علی سے جا کر مل جاؤ، اور اُن کو پیچھے سے آواز نہ دینا۔ اُن کو چاہیے کہ کھڑے ہو جائیں اور ادھر اُدھر نہ دیکھیں یہاں تک کہ میں آجاؤں" چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور حضرت علی کو چند باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا "اے علی تمہارے ذریعہ اللہ کسی ایک شخص کو ہدایت دے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اُن تمام چیزوں سے جن پر آفتاب طلوع کرتا ہے"۔[2]

فضل و کمال حضرت ابورافع فضل و کمال میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ان سے اڑسٹھ (۶۸) روایتیں مروی ہیں۔ جن میں سے ایک میں بخاری اور تین میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن حضرات نے ان سے روایتیں نقل کیں اور علمی استفادہ کیا اُن کے نام یہ ہیں: صاحبزادوں میں حسن، رافع، عبید اللہ، معتمر۔ پوتوں میں: حسن، صالح۔ عام اصحاب میں عطاء بن یسار ابو غطفان بن طریف۔ ابوسعید مقبری۔ اور سلیمان بن یسار۔

---

[1] ابن سعد قسم اوّل جزء ۴ ص ۵۱

[2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹۸۔

حضرت ابورافعؓ ایک خادم کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے تھے۔ اس لئے سرور کائنات کی زندگی کی معمولی معمولی جزئیات سے متعلق ان کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ واقفیت تھی اسی بناء پر اجلۂ صحابہؓ ان سے استفادہ کرتے تھے حضرت ابورافع کے پوتے عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس میرے دادا کے پاس ایک کاتب کو لے کر آئے اور آنحضرتؐ کے متعلق سوال کرتے کہ آپ نے فلاں دن کیا کیا کام کیئے تھے۔ وہ بتاتے جاتے اور کاتب تحریر کرتا جاتا تھا[۱]۔

حضرت ابورافع کے شرف و مجد کے لئے یہی کیا کم ہے کہ جب آنحضرتؐ نے آزاد کر کے اُن کو اپنے خاندان میں شامل کر لیا تو فرمایا مولی القوم من انفسھم اس کے بعد شرافت و نجابت اور فضیلت و بزرگی کا کونسا مرتبہ باقی رہتا ہے[۲]۔

حضرت ابورافع کو اس نسبت پر بڑا فخر و ناز تھا اور وہ اس کو کسی قیمت پر بھی دبنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے متعلق صاحب تہذیب التہذیب نے ایک روایت لکھی ہے کہ عمرو بن سعید بن عاص نے مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں ان سے پوچھا "تم کس کے مولیٰ ہو؟" اُنھوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا"۔ عمرو بن سعید نے کہا "نہیں! تم ہمارے غلام ہو" اُنھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ عمرو نے اُن کے پانسو دُرّے لگائے اور بالآخر اُنھوں نے اقرار کر لیا" ہمارے خیال میں اوّل تو یہ روایت درست ہی نہیں۔ جیسا کہ خود صاحب تہذیب التہذیب نے اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

ولا تبین لی ذالک بل عندی انّہ غیرہٗ[۳]	میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے بلکہ یہ کوئی اور ابورافع ہیں۔

---

[۱] اصابہ ج ۴ تذکرہ حضرت ابن عباس [۲] سنن ابو داؤد [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۳

اور اگر ان سے ہی متعلق ہو، تو صحیح یہ ہے کہ آخر دم تک یہ اپنے تئیں آنحضرت صلعم کا غلام کہتے رہے، اور عمرو کی غلامی کو تسلیم نہیں کیا، جیسا کہ بعض اور روایتوں سے ثابت ہوتا ہے

شادی اور اولاد | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی آزاد کردہ جاریہ سلمٰی سے کر دیا تھا جو صاحبزادۂ ابراہیم کی آیا تھیں۔ ان سے عبداللہ تولد ہوئے[1] ان کے علاوہ حضرت ابورافع کی اولاد کے نام حسب ذیل ہیں :-

حسن، رافع، معتمر، مغیرہ، سلمٰی[2]

وفات | وفات کے متعلق اختلاف ہے، کوئی حضرت عثمان کے آخر عہد خلافت میں بتاتا ہے، مگر غالباً صحیح یہ ہے کہ حضرت علی کے ابتدائی عہدِ خلافت میں انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔ اصل یہ ہے کہ ابورافع نام کا ایک شخص ابواحیحہ سعید بن العاص کا غلام تھا۔ ان دونوں کے واقعات ایک دوسرے سے ملتبس ہو گئے ہیں[3]

---

[1] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۱۱، [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۲ [3] ایضاً ص ۹۳

حضرت شقران صالح

نام ونسب صالح نام، شقران لقب، اور والد کا نام عدی تھا۔ حبشی نژاد تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے غلام تھے، بعد میں اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہ طور ہدیہ پیش کر دیا۔ آپ نے اُن کو خلعتِ آزادی سے مشرف فرمایا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات نے قیمتاً خریدا تھا۔ لیکن یہ قول بہت ضعیف ہے، خود ارباب سیر نے "قیل" کے ساتھ لکھا ہے[1]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں ہے جس سے آپ کا کسی غلام کو قیمت کے بدلے میں خریدنا ثابت ہو۔

خدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو غزوۂ مریسیع میں اموالِ غنیمت کے جمع کرنے اور بدر میں قیدیوں کی دیکھ بھال پر متعین کیا تھا[2]۔ اُنہوں نے قیدیوں کی نگرانی اس نرمی اور ملاطفت سے کی کہ ان سب نے اُن کو اس قدر معاوضہ دیا کہ مال غنیمت میں سے جن کو حصّہ ملا تھا حضرتِ شقران اُن سب سے اچھے رہے[3]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شقران کی حسنِ خدمات سے بہت خوش تھے یہاں تک کہ آپ نے وفات کے وقت خاص طور سے اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی وصیت فرمائی۔ حضرت شقران بھی اپنے آقا کے ایسے جاں نثار غلام ثابت ہوئے کہ جس دامنِ کرم سے ایک مرتبہ وابستہ ہو گئے تھے آخر تک اُس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُن کی وفاکوشی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سیدِ کونینؐ کے جسمِ مطہر کی امانت زمین کے سپرد کی گئی تو اس موقع پر حضرت شقران بھی آل بیت اطہار کے

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۹ [2] اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹ [3] طبقات ابن سعد قسم اوّل جز ۳ ص ۳۴

ساتھ موجود تھے ۔ جو چادر اُس وقت رحمۃٌ للعالمین کے زیب بدن تھی حضرت شقران اُس کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ملأ قدس کی یہ امانت باعظمت سپرد زمین ہوکر چشم ظاہر سے قیامت تک کے لئے مستور ہوگئی[1]۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ وسلّم

حضرت شقران سے بعض احادیث بھی مروی ہیں ۔ عبید اللہ بن ابی رافع نے اُن سے روایت کی ہے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت شقران کہاں رہے ؟ اس میں اختلاف ہے ۔ بغوی فرماتے ہیں کہ مدینہ میں قیام رہا، اور بعضوں کا خیال ہے کہ بصرہ چلے گئے ۔ ٹھیک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی جائے وفات اور وقت وفات بھی معلوم نہیں ہے ۔

---

[1] اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹ [2] ایضاً

حضرت خبّاب بن ارتؑ

نام ونسب خَبّاب نام، ابو عبداللہ کنیت، والد کا نام ارت تھا ان کے نسب میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں خزاعی تھے۔ مگر صحیح یہ ہے بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے عہد جاہلیت میں غلام بنا کر مکہ میں فروخت کئے گئے۔ ان کے آقا کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کے آقا عتبہ بن غزوان تھے اور کسی نے ان کو ام انمار بنت سباع الخزاعیہ کا غلام کہا ہے۔[1]

اسلام حضرت خباب اُن سعادت مند بزرگوں میں سے ہیں جن کی کلاہِ فخر کا طرۂ امتیاز السابقون الاوّلون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی حضرت ارقم کے گھر میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے کہ حضرت خباب اسلام کی نعمت بے زوال سے مشرف ہو گئے۔[2] اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چھٹا تھا۔ اسی بنا پر آپ کو "سادس الاسلام" کہتے تھے۔

یہ وقت اُن چند مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور صبر آزما تھا۔ آنحضرتؐ اپنے چچا ابو طالب کی وجہ سے محفوظ تھے، اور حضرت ابوبکرؓ اپنی قوم میں ممتاز تھے۔ اس لئے وہ بھی کفارِ مکہ کے شر سے امن میں تھے۔ حضرت خبّاب غلام تھے کوئی ان کا یار و مددگار نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام کا اعلان کیا تو کافروں کا غیظ و غضب ان کے خلاف اُبل پڑا۔ یہ اُن مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھے جن کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں لٹا دیتے تاکہ لوہے کی گرمی سے اُن کا جسم تپنے لگے، کبھی ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیتے جلتے اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ کر ایک آدمی مسلتا۔ حضرت خباب یہ انسانیت سوز مظالم برداشت کرتے، انگاروں پر لوٹتے لوٹتے گوشت کباب کی طرح بھننے لگتا۔ لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود جو زبان بادہ توحید کے ذائقہ کام نواز سے ایک مرتبہ آشنا

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶ [2] اصابہ ج ۲ ص ۱۰۱

ہو چکی تھی وہ کس طرح اس ظلم و جبر سے مرعوب ہو کر کلمۂ حق سے انحراف کر سکتی تھی۔ رحمت دو عالم حضرت خبابؓ کی ان مصیبتوں کا حال سُن کر انتہا درجہ ملول ہوتے اور تالیف قلب فرماتے تھے۔ ام انمار کو سرورِ عالم کی ان دلجوئیوں کا علم ہوتا تو اپنے ظلم میں اور شدت پیدا کر دیتی، اور لوہا آگ میں تپا کر اُن کا سر داغتی تھی[1]۔ ایک مرتبہ جب ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی تو حضرت خبابؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی "میرے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعاء فرمائیے کہ وہ مجھ کو اس عذاب سے نجات عطا فرمائے" آپ نے دعا فرمائی "خدایا خبابؓ کی مدد کر"[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کا اثر یہ ہوا کہ اُم انمار کے سر میں ایسی تکلیف شروع ہوئی کہ وہ کتوں کی طرح بھونکتی تھی۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ سر کو داغ لگوانا چاہیے چنانچہ حضرت خبابؓ گرم کیا ہوا لوہا اُم انمار کے سر پر رکھ کر داغ دیتے تھے[2]۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُن سے فرمائش کی کہ تم نے مکہ میں جو مصیبتیں برداشت کی ہیں اُنہیں بیان کرو۔ حضرت خبابؓ نے اپنی پشت دکھائی تو حضرت عمرؓ بولے "آج تک میں نے کسی کی پشت ایسی نہیں دیکھی ہے۔ حضرت خبابؓ نے فرمایا "آگ جلائی جاتی تھی اور اُس پر میرے جسم کو تپایا جاتا تھا یہاں تک کہ میری پشت کی چربی اُس کو بجھا دیتی تھی (اُسد الغابہ)

جسمانی سزا کے علاوہ ان لوگوں نے مالی نقصان پہنچانے میں بھی کمی نہیں کی۔ حضرت خبابؓ لوہار کا کام کرتے تھے اِس سلسلہ میں اُن کا عاص بن وائل پر کچھ قرضہ تھا۔ یہ جب کبھی تقاضہ کرنے جاتے، وہ کہتا کہ میں اُس وقت تک ادا نہیں کرونگا جب تک کہ تم محمدؐ کا دامن نہیں چھوڑو گے۔ حضرت خبابؓ فرماتے "جب تک تو دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آئے گا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن نہیں چھوڑونگا"۔ اس پر وہ بولتا "اچھا میں

---

[1] ابن سعد ج ۳ تذکرہ حضرت خبابؓ۔ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔ [3] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶۔

مرکر دوبارہ زندہ ہونگا، اور اپنے مال واولاد کی طرف لوٹ کر آؤں گا، تب تمہارا قرضہ ادا کر دونگا۔" (عاص بن وائل کا یہ کہنا عقیدۂ قیامت پر ایک طرح کی تعریض تھی) اس واقعہ پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا	اے محمد! کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا ہے اور اُس نے کہا کہ مجھ کو مال اور اولاد دیجائیگی یہ شخص کیا غیب سے باخبر ہو گیا ہے یا اُس نے خدا سے عہد لے لیا ہے ہرگز نہیں۔ یہ جو کچھ کہتا ہے ہم اُس کے وارث ہونگے اور یہ تنہا ہمارے سامنے لایا جائیگا۔

ہجرت ایک عرصہ تک مصائب وآلام کا مقابلہ کرنے کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا، تو ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور فراش بن صمہ کے غلام تمیم میں اور بعض کے نزدیک جبیر بن عتیک میں مواخات کرادی تھی۔[2]

غزوات حضرت خباب بدر، اُحد، خندق اور تمام غزوات میں شریک رہے۔

فضائل حضرت خباب ایمان وعمل کے اعتبار سے نہایت پختہ اور مضبوط تھے۔ اس بناء پر تمام صحابہ میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل تھی، حضرت عمر بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خباب حضرت عمر سے ملنے آئے تو آپ نے اُن کو اپنے گدے پر بٹھایا، اور لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا" ان کے علاوہ صرف ایک شخص اور ہے جو اس گدے پر بیٹھنے کا مستحق ہے۔" حضرت خبابؓ نے پوچھا۔" امیر المومنین! وہ کون ہے؟" فرمایا" بلال!" بولے" وہ میرے برابر کس طرح مستحق ہو سکتے ہیں۔ مشرکین میں اُن کے بہت سے مددگار تھے، مگر میرا پوچھنے والا سوائے خدا اور کون تھا؟" پھر اپنا استحقاق بتاتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سُنائی۔

---

[1] بخاری کتاب التفسیر باب قولہ ونرثہ مایقول۔ [2] اسد الغابہ ومستدرک ج ۳ ص ۳۸۲۔

حضرت خبابؓ علم کی بڑی جستجو رکھتے تھے، کبھی کبھی رات رات بھر آنحضرتؐ کے طریقۂ عبادت کو دیکھتے رہتے اور صبح کو اُس کے متعلق استفسار کرتے ایک مرتبہ اُنہوں نے پوچھا "یا رسول اللہ آپ نے رات جیسی نماز پڑھی ایسی کبھی نہیں پڑھی۔ فرمایا رات کی نماز خوف ورجا کی نماز تھی۔ میں نے خدا سے اپنی اُمت کے لئے تین چیزوں کی دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں منظور کرلی گئی ہیں، تیسری منظور نہیں ہوئی[1]

حضرت خبابؓ کی مرویات کی تعداد تینتیس ۳۳ ہے، ان میں سے دو متفق علیہ ہیں اور دو میں امام بخاری اور ایک میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن بزرگوں نے اُن سے روایت کی ہے اُن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

آپ کے صاحبزادے عبداللہ اور ابو امامہ باہلی۔ ابو معمر۔ عبداللہ بن سنخبرہ، قیس بن ابی حازم، مسروق بن اجدع، علقمہ بن قیس، عمرو بن شرحبیل شعبی، حارثہ بن مضرب[2]

روایت میں احتیاط احتیاط وانکسار نفس کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ مسجد میں چند اصحاب بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں حضرت خبابؓ تشریف لے آئے، اور خاموش ہوکر بیٹھ گئے، لوگوں نے کہا کہ ہم سب اس وقت آپ کے پاس اس لئے جمع ہیں کہ آپ ہم سے کوئی بات کہیں یا کسی چیز کا حکم کریں۔ آپ نے فرمایا "میں کس بات کا حکم کروں، ممکن ہے میں آپ لوگوں کو کسی امر کا حکم کروں اور خود اُسے نہ کرتا ہوں[3]

ذریعہ معاش زمانۂ جاہلیت میں اور اُس کے بعد بھی عرصہ تک آہنگری کا پیشہ کرتے رہے اسلام کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگی میں بسر ہوا۔ مگر کچھ دنوں بعد خدا نے مرفہ الحالی دی اور اتنی دولت ملی کہ پھر کسی پیشہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی۔ وفات کے وقت چالیس ہزار درہم چھوڑے[4]

علالت و وفات ۳۷ھ میں کوفہ میں بیمار ہوئے، اور چند روز کے بعد وہیں وفات ہوگئی۔ وفات سے کچھ دیر قبل اپنے صاحبزادے عبداللہ کو وصیت کی کہ مجھ کو کوفہ کے باہر میدان

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۰، [2] ایضاً۔ [3] اُسد الغابہ [4] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔

میں دفن کرنا۔ اس سے قبل کوفہ کے لوگ اپنے مُردوں کو گھروں کے سامنے یا شہر کے اندر ہی دفن کرتے تھے۔ حضرت خبّاب اپنی وصیت کے مطابق شہر کے باہر میدان میں دفن کئے گئے تو ایک جلیل القدر صحابی کے قرب سے شرف اندوز ہونے کے لئے اہل کوفہ نے بھی اپنے مردے وہیں دفن کرنے شروع کر دیے[۱]۔

مرض الموت میں کچھ لوگ عیادت کرنے آئے، اور کہنے لگے "ابو عبداللہ آپ خوش ہو جیئے کہ کل آپ حوض کوثر پر اپنے بھائیوں سے ملاقات کریں گے" یہ سنتے ہی حضرت خبّاب پر رقت طاری ہو گئی اور فرمایا "تم نے ایسے بھائیوں کا ذکر کیا ہے جو گذر گئے اور انہوں نے اپنا کوئی اجر دنیا میں نہیں پایا، ہم ان کے بعد رہے اور دنیا سے اس قدر حصّہ پایا کہ ڈر ہے کہیں وہ ہی ہمارے اُن اعمال کا ثواب نہ ہو"۔

حضرت خبّاب نے مرض الموت میں اس قدر تکلیف اُٹھائی کہ وہ خود فرماتے ہیں، "اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعا سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے لئے موت کی دعا مانگتا" آخرامر اسی حالت میں تہتّر برس کی عمر میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے پیشرو احباب و رفقاء سے جا ملے۔ رضی اللہ عنہٗ۔

حضرت علیؓ صفین کی جنگ سے واپس آ رہے تھے کہ کوفہ کے باہر میدان میں انہیں سات قبریں نظر آئیں۔ لوگوں سے پوچھا "کس کی ہیں؟ جواب ملا سب سے پہلے حضرت خبّاب اپنی وصیت کے مطابق یہاں دفن کئے گئے تھے، پھر اُن کے اتباع میں لوگوں نے اپنے مُردے بھی یہاں دفن کرنے شروع کر دیے ہیں۔" حضرت علیؓ نے فرمایا "اللہ خبّاب پر رحم کرے، وہ اپنی رغبت سے مسلمان ہوئے۔ اپنی خوشی سے ہجرت کی، مجاہدانہ زندگی بسر کی، اُن کے جسم کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اللہ تعالیٰ نیک عمل لوگوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا" اس کے بعد آپ نے اور قریب ہو کر تمام اہل قبور کے لئے دعا پڑھی[۲]۔

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔ [۲] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۸۔

حضرت خباب مولائے عتبہ بن غزوان

حضرت عتبہ بن غزوان کے غلام تھے - غزوۂ بدر اور دیگر تمام غزوات میں آنحضرتؐ کے شریک رہے - مدینہ میں ۳۷ھ میں پچاس سال کی عمر میں وفات پائی - اور حضرت عمرؓ نے جو اُس وقت سریر آرائے خلافت تھے نماز جنازہ پڑھی بعض لوگوں کو ان میں اور حضرت خباب بن ارت میں اشتباہ ہو گیا ہے - مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں بالکل الگ الگ ہیں - عتبہ بن نوفل بن عبد مناف کے حلیف تھے خباب کی کنیت ابو یحییٰ تھی، اور اُن سے کوئی روایت منقول نہیں ہے[1]

حضرت خبّاب مولائے فاطمہ بنت عتبہ

عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی فاطمہ کے غلام تھے ان کے صحابی ہونے میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ حضور کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا ابو السائب اور ابو سلمہ کنیت تھی انکے بیٹے سائب کا شمار حجاز کے بڑے عالموں اور حدیث کے راویوں میں ہے[2]

اُسد الغابہ اور اصابہ میں اِن سے دو روایتیں منقول ہیں[3]-

بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہو گیا ہے کہ سائب کے والد خبّاب اور فاطمہ کے غلام خبّاب دو جدا جدا شخصیتوں کے نام ہیں مگر یہ درست نہیں - امام بخاری کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ دونوں کو ایک ملتے ہیں دیکھو اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۱۰۲-

---

[1] اُسد الغابہ تذکرہ حضرت خبّاب - [2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۸ و ۱۰۹ [3] اصابہ ج ۲ ص ۱۰۲-

حضرت ابوکبشہ

سلیم نام، ابوکبشہ کنیت، وطن ونسب کے اعتبار سے کوئی ان کو فارسی۔ بعض دوسی اور بعض مکی بتاتے ہیں۔ غلام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو خرید کر آزاد کردیا۔

اسلام | اسلام کا زمانہ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ غلامی سے قیاس ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کے شروع زمانہ میں ہی اسلام قبول کرلیا ہوگا۔ ہجرت کی اجازت ہوئی تو مدینہ پہنچے اور کلثوم بن ہدم کے یہاں مقیم ہوئے۔

غزوات | بدر کے معرکہ میں شریک تھے۔ اس کے بعد اُحد اور دوسرے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔

وفات | ۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۳ھ یوم سہ شنبہ جس دن حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے وفات پائی۔[1]

---

[1] ابن سعد ج ۳ قسم اول ص ۳۳۔

حضرت زید بن بولیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابو یسار کنیت تھی۔
ابن شاہین کہتے ہیں کہ آپ نے اُن کو غزوۂ بنی ثعلبہ میں پایا تھا اور آزاد کر دیا تھا۔ اِن
کے پوتے بلال بن یسار کی وساطت سے امام ابو داؤد و ترمذی نے ان سے روایت
کی ہے۔ روایت یہ ہے، زید کہتے ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے
سُنا جس نے (دل کی پاکی اور ارادے کی سچائی کے ساتھ) استغفر اللّٰہ الذی لا اِلٰہ
اِلّا ھو الحیّ القیّوم و اَتُوبُ اِلیہ۔ یہ دعا پڑھ لی اس کی بخشش ہو گئی اگرچہ وہ جہاد (جیسے
عظیم الشان عمل) سے بھاگ گئے اور اس میں پیٹھ دکھانے کا مجرم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حبشی تھے۔[1][2]

حضرت زید الدیلمی

سلیم بن مازن کے غلام تھے، ان کے بیٹے سنان کہتے ہیں کہ میرے والد نے
آقا سلیم بن مازن کے ہمراہ حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آقا اور غلام
دونوں بیک وقت اسلام سے مشرف ہوئے اور دونوں نے سرکار ابد قرار کی غلامی
کا حلقہ اپنے کانوں میں ڈالا۔[3]

---

[1] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۱ [2] اصابہ ج ۳ ص ۲۲ [3] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۳۰

حضرتِ عکرمہ

نام ونسب عکرمہ نام، ابو عبداللہ کنیت اہل مغرب کے بربر سے تعلق رکھتے تھے۔ حصین بن الحیر العنبری کے غلام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ کے گورنر ہو کر گئے تو حصین نے حضرت عکرمہ کو حضرت ابن عباس کی غلامی میں ہبتہً منتقل کر دیا[1]۔ حضرت عکرمہ کی عمر اس وقت بہت تھوڑی تھی، اس لئے اُن کی تمام تعلیم وتربیت حضرت ابن عباس کے ہی دامان فضل وکرم میں ہوئی جس کے باعث وہ غلام ہونے کے باوجود علم وکمال کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکے۔

تعلیم حضرت عکرمہ میں تحصیل علم کا شوق خداداد تھا، اور پھر اُنہیں حضرت ابن عباس الیسا حبر اُمت، ترجمان القرآن بزرگ مل گیا۔ حضرت ابن عباس نے اُن کو تعلیم دینے میں بڑی کوشش اور جد وجہد سے کام لیا سفر حضر میں ساتھ رکھتے تھے اور قرآن وسُنن کی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عکرمہ نے مسلسل چالیس برس تک اپنے شفیق آقا کی خدمت میں علم کی تحصیل کی۔

فضل وکمال شاگرد کے ذوق اور اُستاد کی توجہ بے غایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتِ عکرمہ علم کے دریائے بے پایاں بن گئے۔ ابن سعد لکھتے ہیں۔

کان کثیرا العلم بحراً من البحور ۔ بہت علم رکھتے تھے اور ایک سمندر تھے۔

امام بخاری نے فرمایا "کوئی ایسا نہیں ہے جو عکرمہ سے احتجاج نہ کرتا اور سند نہ پکڑتا ہو" یحییٰ بن معین فرماتے تھے "عکرمہ معتبر ہیں اور تم جس کسی کو دیکھو کہ اُن کی شان میں بے اعتباری کا اظہار کرتا ہے اُس کے اسلام میں شک ہے" عمرو بن دینار

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹ -

کہتے ہیں "مجھ کو حضرت ابو الشعثاء نے چند مسائل دیے اور کہا" ان کی بابت حضرت عکرمہ سے پوچھ لو کہ وہ سمندر ہیں۔ تم اُن سے مسائل دریافت کیا کرو" احمد بن عبداللہ العجلی نے فرمایا" عکرمہ معتبر ہیں اور لوگ اُنہیں جس چیز سے متہم کرتے ہیں اُس سے بری ہیں" حضرت عکرمہ خود فرماتے ہیں" بازار جاتا ہوں اور وہاں کسی شخص سے کوئی کلمہ سُنتا ہوں تو اُس سے علم کے پچاس دروازے میرے اوپر کھل جاتے ہیں[1] ابو الشعثاء ان کو "اعلم الناس" کہتے تھے۔ اور حافظ ذہبی نے اِن کو "الحبر العالم" لکھا ہے۔[2]

تفسیر میں کمال | حضرت ابن عباس تفسیر قرآن کے امام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اُن کے لئے تفسیر و تاویل کے علم کے حاصل ہونے کی دعا فرمائی تھی۔ اس بنا پر حضرتِ عکرمہ بھی اُن کے فیض صحبت و توجہ سے تفسیر کے امام ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس کو خود کسی آیت میں شبہ ہوتا تو اس کے لئے حضرتِ عکرمہ سے ہی رجوع کرتے تھے ایک مرتبہ آپ نے یہ آیت پڑھی:۔

لم تعظون قوماً اللّٰہُ مھلکھم او مُعَذِّبُھُمْ عَذَاباً شَدِیْداً۔	تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا اُن کو شدید عذاب دینے والا ہے۔

اور حضرتِ عکرمہ سے پوچھا" مجھے نہیں معلوم اِن لوگوں نے نجات پائی یا ہلاک ہوئے" عکرمہ نے پورے وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ یہ لوگ ناجی ہو گئے۔ حضرت ابن عباس نے خوش ہو کر اُن کو ایک حلہ عطا فرمایا۔[3]

عثمان بن حکیم کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ابو امامہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں عکرمہ آئے اور فرمانے لگے" اے ابو امامہ! تم کو خدا کا واسطہ، تم نے کبھی حضرت ابن عباس رضؓ سے سُنا ہے کہ عکرمہ تم سے جو کچھ کہے اُس کی تصدیق کرو۔ وہ کبھی جھوٹ

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۴۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰۔

[3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۶۵

نہیں بولتے؟" ابو امامہ نے فرمایا "ہاں"۔[1]

حضرت سعید بن جبیر تابعین میں تفسیر کے امام ہیں اُن سے کسی نے پوچھا "آپ اپنے سے کسی اعلم کو جانتے ہیں" فرمایا "ہاں! وہ عکرمہ ہیں" امام شعبی فرماتے تھے "اب اللہ کی کتاب کو جاننے والا عکرمہ سے زیادہ کوئی نہیں ہے" حضرت قتادہ فرماتے تھے "تابعین میں سب سے بڑے عالم چار ہیں عطاء، سعید بن جبیر، عکرمہ اور حسن۔ انہی حضرت قتادہ سے دوسرا قول منقول ہے "عکرمہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں تم اُن کے پاس بیٹھا کرو۔"

ایک مرتبہ حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر نے حضرت عکرمہ سے بعض آیات کی تفسیر سے متعلق چند سوالات کئے۔ حضرت عکرمہ نے اُن سب کے جوابات نہایت تسلی بخش دیے۔ جب یہ دونوں حضرات خاموش ہو گئے تو حضرت عکرمہ نے فرمایا "فلاں آیت کا نزول فلاں واقعہ سے متعلق ہے اور فلاں آیت کا شانِ نزول یہ ہے۔"

ایوب کہتے ہیں "جب سے عکرمہ بصرہ میں داخل ہوئے ہیں حضرت حسنؒ نے تفسیر بیان کرنی بہت کم کر دی ہے" انہی ایوب المصری سے ابن خریج نے پوچھا "کیا تم نے عکرمہ کی تقریریں قلمبند کی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا "تم سے دو تہائی علم فوت ہو گیا۔"

حضرت عکرمہ جرجان تشریف لے گئے تو وہاں لوگوں نے شہر بن حوشب سے دریافت کیا "کیا ہم عکرمہ کے پاس نہ جائیں؟" فرمایا "تم اُن کے پاس ضرور جاؤ۔ کیونکہ کوئی اُمت ایسی نہیں ہے جس کا کوئی حبر نہ ہو۔ ہماری اُمت کا حبر ابن عباس کا غلام ہے"۔[2]

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۶۵ - [2] یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب سے منقول ہیں۔

فقہ | تفسیر کے ساتھ فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے اُن سے فرمایا "تم جاؤ اور لوگوں کو فتاویٰ دو، میں تمہارا مددگار ہوں" عکرمہؒ بولے "اگر لوگ جتنے اب ہیں اس سے دُگنے بھی ہو جائیں میں اُن کو اُس وقت بھی فتوے دونگا" حضرت ابن عباس نے پھر فرمایا "جاؤ اور فتوے دو اگر کوئی تم سے کام کی بات دریافت کرے تو اُسے فتوی دینا ورنہ چپ رہنا" حضرت عکرمہ اپنے عہد میں مرجع خلائق تھے ایوب المصری کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ ارادہ کر رہا تھا کہ حضرت عکرمہ کے پاس جاؤں، ابھی بصرہ کے بازار میں تھا کہ کسی نے کہا" یہ عکرمہ جا رہے ہیں" میں اُن کی سواری کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لوگ آتے تھے اور پوچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے میں اس کو یاد کرتا جاتا تھا[1]۔ انہی ایوب کا بیان ہے ایک مرتبہ عکرمہ ہمارے یہاں آئے اُن کے پاس لوگوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ وہ مجبور ہو کر چھت پر چڑھ گئے[2]۔

حدیث | تفسیر و فقہ کے علاوہ حدیث اُن کا خاص فن تھا۔ تفسیر کی طرح انہیں اس میں بھی بڑا کمال تھا حضرت ابن عباسؓ اُن کے اُستاد شفیق تھے ہی۔ ان کے سوا انہوں نے صحابہ میں حضرت علیؓ، ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابوسعید خدریؓ، عقبہ بن عامرؓ حجاج بن عمروؓ بن غزیہ، معاویہ بن ابی سفیان، صفوان بن اُمیہ، یعلی بن اُمیہ، جابرؓ، ابوقتادہؓ، اُم المومنین عائشہؓ اور رحمنہ بنت جحش سے بھی استفادہ کیا تھا[3]۔

حدیث میں ان کی وسعت علم کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت ابن عباس کی مرویات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اُن میں اکثر روایتیں عکرمہ کے واسطہ سے ہی منقول ہیں ابن سعد ان کو "کثیر الحدیث" بتاتے ہیں۔

جس طرح حضرت عکرمہ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے، اُن کے تلامذہ بھی کثیر التعداد ہیں۔ صاحب تہذیب التہذیب نے ایک صفحہ میں اُن کے نام درج کئے ہیں

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، صفحہ ۲۶۶ [2] ابن سعد ج ۵ صفحہ ۲۱۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، صفحہ ۲۶۲۔

ہم مشاہیر تلامذہ کے اسماءِ گرامی ذیل میں لکھتے ہیں، جس سے حضرت عکرمہ کی جلالتِ شان دا بہت علم وفضل کا اندازہ ہوگا۔

ابراہیم نخعی، امام شعبی، قتادہ، سماک بن حرب، عاصم الاحول، ابواسحٰق سبیعی، ابوالزبیر، حصین بن عبدالرحمٰن، ایوب، خالد، داؤد بن ہند، عاصم بن بہدلہ، موسیٰ بن عقبہ، عمرو بن دینار، عطاء بن سائب، یحییٰ بن سعید انصاری، یزید بن ابی حبیب، ابواسحٰق شیبانی ہشام بن حسان، یحییٰ بن کثیر، حکم بن عیینہ، داؤد بن الحصین، محمد بن سیرین، ابوالشعثاء وغیرہ۔

حضرت عکرمہ پر بعض لوگوں نے جرح کی ہے اور اُن کے متعلق بُری رائے ظاہر کی ہے ان حضرات میں زیادہ نمایاں شخصیت امام مالک اور امام مسلم کی ہے ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عکرمہ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ خوارج کے ایک فرقہ صفریہ کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک اُن کی روایت کا تعلق ہے، اکثر ائمۂ مذہب نے اُنہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے۔ امام بخاری تو یہاں تک فرماتے تھے کہ "مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جس نے حضرت عکرمہ سے احتجاج نہ کیا ہو" حاکم ابواحمد فرماتے ہیں "اُن کی حدیث سے ائمۂ قدماء نے سند لی ہے"

ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی فرماتے ہیں "عام علماءِ حدیث نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت عکرمہ کی حدیث سے حجت پکڑنی چاہیئے" امام مسلم ان کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے تاہم اُنہوں نے اُن کی روایت کو قبول کیا ہے، اور جرح کے بعد تعدیل کی ہے امام مسلم کے ماسوا امام بخاری، ابوداؤد، نسائی ان سب نے اپنی صحاح میں حضرت عکرمہ کی مرویات درج کی ہیں[1]

قوتِ تقریر | ان فضائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ جو بات بیان کرتے تھے، اُس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں۔

---

[1] یہ سب معلومات تہذیب التہذیب جلد ۷، از صفحہ ۲۷۱ تا ۲۷۳ ماخوذ ہیں۔

"عکرمہ جب مغازی پر کلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اُسے سُنے تو یہ محسوس ہو کہ گویا وہ خود اربابِ مغازی کو دیکھ رہا ہے اور تمام واقعات اُس کے سامنے سے ہی گزر رہے ہیں۔"

غلامی سے آزادی | یہ عجیب بات ہے کہ ارباب سیر لکھتے ہیں "حضرت ابن عباس رض کی وفات کے وقت حضرت عکرمہ غلام ہی تھے۔ ابن عباس رض کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادہ علی نے عکرمہ کو چار ہزار دینار کے بدلے میں فروخت کر دیا۔ اس پر عکرمہ نے کہا "افسوس! تم نے اپنے باپ کا علم چار ہزار دینار کے عوض بیچ ڈالا" علی کو اس سے بڑا تاثر ہوا اور بیع کا اقالہ کر لیا۔ پھر حسبۃً للہ آزاد کر دیے گئے[1]۔

لطافت طبع | مزاج لطافت پسند پایا تھا۔ کسی اچھی آواز کو بھی سُنتے تو اُس سے متاثر ہو جاتے تھے۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں "ایک مرتبہ عکرمہ بصرہ آئے ہوئے تھے چند لوگ اُن سے ملنے آئے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کہیں سے عمدہ گانے کی آواز آنے لگی حضرت عکرمہ بولے "چپ رہو" اور گانا سُننا شروع کر دیا، وہ ختم ہو گیا تو فرمایا "کمبخت کس قدر عمدہ گا رہا تھا"[2]۔

سیر و سیاحت کا شوق | حضرت عکرمہ کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے یمن، مصر، افریقہ اور اصفہان و خراسان و سمرقند ان سب کی سیاحت کی تھی[3]۔

وفات | سنہ ۱۰۵ھ یا سنہ ۱۰۶ھ میں اسی یا چوراسی برس کی عمر میں مدینہ میں وفات پائی۔ اتفاق سے اسی دن عرب کے مشہور غزل گو شاعر کثیر عزہ نے انتقال کیا تھا، لوگوں نے کہا "افسوس آج افقہ الناس (عکرمہ) اور اشعر الناس (کثیر) دونوں کا انتقال ہو گیا۔" دونوں پر بعد ظہر ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قیروان (شمالی افریقہ) میں وفات ہوئی تھی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے[4]۔

---

[1] شذرات الذہب ج ا ص ۱۳۰۔ [2] شذرات الذہب ج ا ص ۱۳۰۔

[3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۷۰۔ [4] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱

اولاد | شادی اور اولاد کے متعلق تفصیل سے معلوم نہیں - البتہ علامہ ابن خلکان نے عمارہ بن حمزہ کو خطیب بغدادی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ کا پوتا بتایا ہے [۱]

حضرت ابورافع ثانی

یہ دوسرے ابورافع ہیں سعید بن عاص کے غلام تھے، سعید کے بعد اُس کے بیٹوں کی ملکیت میں گئے،

خالد کے علاوہ سعید کے تمام بیٹوں نے اپنے اپنے حصہ کو آزاد کر دیا تھا خالد نے اپنا حصہ آنحضرت صلعم کو ہبہ کر دیا، حضور نے بھی اپنا حصہ آزاد کر دیا اور اس طرح ابورافع مکمل طور پر غلامی سے نکل کر آزاد ہو گئے، ہمیشہ بہ انداز فخر کہا کرتے تھے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام ہوں [۲]۔

ابورافع کے پوتے عثمان نے اپنے دادا کے آزاد ہونے کا واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ جب ابورافع مسلمان ہو کر اور ہجرت کر کے مدینہ آئے تو حضور نے خالد سے اُن کے معاملہ میں گفتگو فرمائی اس وقت خالد نہ تو اُن کو آزاد کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور نہ ہبہ اور بیع کے لئے، لیکن بعد میں خالد کو اپنی اس جرأت پر بڑی ندامت ہوئی اور ابورافع کے رقبہ پر ان کا جو حصہ تھا وہ اُنہوں نے آنحضرت کے نام ہبہ کر دیا اور آپ نے فوراً ہی اُن کو آزاد کر دیا [۳]۔

---

[۱] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۰ - [۲] اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۷ ص ۶۵ [۳] ایضاً

حضرت نافع بن کاؤس

نام ونسب نافع نام ابو عبداللہ کنیت والد کا نام کاؤس یا ہُرمز تھا، دیلم کے رہنے والے تھے حضرت عبداللہ بن عمر کو کسی جنگ میں ملے تھے، اور اُن کے غلام تھے[1]

جس طرح حضرت عکرمہ کو خوش قسمتی سے حضرت ابن عباسؓ کی غلامی میسر آگئی تھی جن کے فیض تعلیم وتربیت سے وہ تابعین کے ائمہ کبار میں سمجھے جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح بخت کی ارجمندی نے حضرت نافع کو حضرت عبداللہ بن عمر کی غلامی میں دے دیا۔ ابن عمرؓ نے نافع کی تعلیم وتربیت بہترین طریقہ پر کی جس کے باعث وہ علم وحدیث وتفسیر کے امام بلند مقام ہوگئے اور اُن کا آستانۂ افادہ ودرس بڑے بڑے احرار ونجبار کے لئے بوسہ گاہِ عقیدت ہوگیا۔

آزادی نافع میں جو جوہر قابل قسام ازل کی طرف سے ودیعت رکھا گیا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ اُس کے صحیح جوہر شناس تھے۔ وہ جانتے تھے اُن کے زیر سایہ غلامی کی گدڑی میں کیسا لعل بے بہا پرورش پا رہا ہے جو ایک دن اپنی روشنی سے ارشاد وہدایت کی محفل کو بقعۂ نور بنا دے گا۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن جعفر نے بارہ ہزار درہم کے عوض اُن کو حضرت ابن عمرؓ سے خریدنا چاہا تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا، ایک دفعہ ابن عامر نے نافع کی قیمت کے سلسلہ میں تیس ہزار درہم پیش کئے حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ ابن عامر کے درہم کہیں مجھ کو فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں" اس کے بعد آپ نے فرمایا: اذھب فانت حرٌ[2] (جاؤ تم آزاد ہو)

---

[1] تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۱۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۱۳۔

تعلیم | حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں تیس سال تک رہے۔ اس عرصہ میں حضرت ابن عمر نے ایسی توجہ خاص سے نافع کی تربیت کی کہ وہ آسمان علم وفضل پر مہر تاباں بن کر نمودار ہوئے۔

علم وفضل | اُن کی علمی جلالت شان کو تمام ائمۂ حدیث نے تسلیم کیا ہے۔ حضرت عکرمہ کے احوال میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تفسیر وحدیث اور فقہ میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے اہل مدینہ میں حضرت نافع حضرت عکرمہ سے بھی افضل سمجھے جاتے تھے[۱]۔

حضرت ابن عمرؓ کے فرزند ارجمند حضرت سالم بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "اگر نافع وسالم میں اختلاف ہوجائے تو نہیں جانتا کس کو ترجیح دوں" امام نووی نے فرمایا "وہ جلیل المرتبت تابعی تھے اُن کی ثقاہت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے"۔ خود حضرت ابن عمرؓ نے کہا "اللہ نے نافع کو عطا فرما کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے[۲]" خلیلی کا بیان ہے کہ نافع مدینہ کے ائمۂ تابعین میں سے تھے اور امام العلم مانے جاتے تھے[۳]۔ حافظ ذہبی اُنہیں "الامام العلم" لکھتے ہیں[۴]۔

حدیث | حضرت ابن عمرؓ حدیث کے بحر بیکراں تھے، نافع تیس سال تک اس بحر سے سیراب ہوتے رہے تھے، اور پھر اُنھوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اور دوسرے سرچشمہائے حدیث سے بھی فیضیاب ہوتے رہے۔ چنانچہ اُنہوں نے صحابہ میں حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ ابوہریرہ، ابوسعید الخدری، ابولبابہ، رافع بن خدیج، عائشہ، ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہم سے اور تابعین میں قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، زید بن عبداللہ، اسلم مولیٰ عمر، ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الصدیق رحمہم اللہ سے حدیث کا سماع کیا[۵]۔ حدیث میں جلالتِ شان کا یہ عالم ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں:-

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳۔ [۲] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳۔ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳
[۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴۔ [۵] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳۔

اصح الاسانید مالک عن نافع - سب سے زیادہ صحیح سند وہ ہے جس میں مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں

عن ابن عمر -

امام مالک فرماتے تھے "جب میں نافع سے ابن عمر کی کوئی حدیث سن لیتا ہوں تو پھر کسی دوسرے سے اس کو سننے کی پروا نہیں کرتا - ابن عُیَینہ کا بیان ہے "نافع کی حدیث سے زیادہ معتبر کس کی حدیث ہے؟" ابن سعد فرماتے ہیں "نافع ثقہ کثیر الحدیث تھے"[۱] ابن فراش نے اُن کو "ثقہ نبیل" (شریف معتبر) کہا ہے[۲] امام بخاری نے جس سلسلۂ اسناد کو اصح الاسانید کہا ہے - علمائے حدیث اس کو "سلسلۃ الذہب" (زنجیر طلائی) کہتے ہیں[۳]

تلامذہ | حضرت نافع کا بابِ افادہ ودرس بہت وسیع تھا اور اُس سے بڑے بڑے ائمۂ دین واکابرِ امت نے استفادہ کیا - چند خاص تلامذہ کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں -

ابواسحٰق سبیعی ، زہری ، حکیم بن عیینہ ، محمد بن عجلان ، صالح بن کیسان ، عبدربہ و یحییٰ ابناء سعید ، یونس بن عبید ، یزید بن ابی حبیب ، موسیٰ بن عقبہ ، میمون بن مہران ، جریر بن حازم حکم بن عتیبہ ، سعد بن ابراہیم ، ابن جریج ، اوزاعی ، مالک بن انس ، اسامہ بن زید اللیثی ، عطاء الخراسانی ، اعمش ، ابن ابی لیلیٰ ، ضحاک بن عثمان[۴] -

امام مالک حضرت نافع کے خاص تلمیذ تھے - بچپن سے ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک ملازم کو لے کر نو عمری کے زمانہ ہی میں حضرت نافع کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا ، وہ تشریف لاتے اور مجھ کو احادیث سُنایا کرتے تھے - صبح کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے - اُس وقت اُن کے پاس کوئی نہیں آسکتا تھا - طلوعِ آفتاب کے بعد مسجد سے تشریف لاتے تھے[۵]

نافع حضرت ابن عمرؓ کی مرویات کے اتنے بڑے عالم تھے کہ خود انہیں اس پر

[۱] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳ - [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۳ -

[۳] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱ - [۴] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳ -

ناز تھا۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے امام زہری کی اس بات کی شکایت کی کہ وہ میرے پاس آتے ہیں میں اُن کو حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں سُنا دیتا ہوں۔ پھر وہ حضرت سالمؒ (حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادہ) کے پاس جاکر اُسی روایت کے متعلق پوچھتے ہیں "کیا اس کی نسبت آپ نے اپنے والد سے کوئی روایت سُنی ہے؟" سالم فرماتے "ہاں" اس کے بعد زہریؒ اُس روایت کو سالم کے حوالہ سے بیان کرتے اور میرا کہیں ذکر نہ کرتے، حالانکہ حدیث کا اصل سیاق میرے پاس ہوتا تھا[۱]

فقہ حضرت ابن عمرؓ کثیر الحدیث ہونے کے ساتھ اجلہ فقہائے صحابہ میں سے بھی تھے نافع اُن کے شاگرد رشید تھے اس لئے فن حدیث میں امامت کی نعمت کے ساتھ فقاہت کی دولت بے پایاں بھی اُن کے حصہ میں آئی تھی۔ حافظ ابن حجر ان کو "نافع الفقیہ" لکھتے ہیں[۲]۔ لیکن اپنے آقازادہ حضرت سالم کا احترام اس درجہ مرعی رکھتے تھے کہ اُن کی موجودگی میں فتوے نہیں دیتے تھے۔ ایک سیاہ چادر اوڑھتے، منہ لپیٹے رہتے، اور کسی سے کلام نہیں کرتے تھے[۳]۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اُن کے علم وفضل کی قدر کرتے ہوئے اُنہیں سُنن کی تعلیم کے لئے مصر بھیج دیا تھا[۴]

وفات ۱۱۷ھ یا ۱۲۰ھ میں وفات پائی[۵]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ - [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۱ - [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴

[۴] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۴ [۵] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱ -

سعید بن جُبیرؒ

نام ونسب سعید نام، ابوعبداللہ یا ابومحمد کنیت۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ بنی والبۃ بن الحارث بن تعلبہ بن دودان کے غلام تھے[1] والبۃ اسد بن خزیمہ کی ایک شاخ تھا اس نسبت سے وہ الوالبی الاسدی کہلاتے ہیں[2]

تعلیم اسلام نے غلاموں کو اکتساب علم وفضل کی جو آزادی عطا فرمائی ہے سعید بن جُبیر اُس کی ایک مثال تاباں تھے۔ اُنہوں نے اُس زمانہ میں ہوش سنبھالا جبکہ اکابر صحابہ کی بڑی تعداد اُٹھ چکی تھی، تاہم جو باقی تھے سعیدؓ نے اُن سے تحصیل علم وکمال میں کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ صحابہ میں اُن کے اُساتذہ کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، اُم المومنین عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، عبداللہ بن مغفل۔ اِن صحابہ کرام میں سعید بن جُبیر نے حضرت ابن عباس سے خاص طور پر استفادہ کیا حضرت ابن عباس جس طرح قرآن کے بہترین ترجمان اور فنِ حدیث کے بحر بیکراں تھے فقہ، فرائض اور ادب وانشاء، شعرو شاعری اور انساب جاہلیت کی معرفت میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اس بنا پر اُن کا درس ان تمام چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر اس حلقۂ درس میں پوری پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ اِن کا تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ باہر کے سائلین جو سوالات کرتے اور مسائل پوچھتے تھے اور حضرت ابن عباس اُن کے جو جوابات دیتے تھے، سعید خموشی کے ساتھ اُن سب کو سُنتے اور یاد کرتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خود بھی کوئی سوال کر لیتے، ورنہ عموماً چپ بیٹھے رہتے تھے۔ شروع میں حضرت ابن عباس

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶ [2] لب الالباب

نے تقریر قلمبند کرنے کی ممانعت فرمادی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے بعد میں لکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ بعض دن اس کثرت سے مسائل پیش آتے تھے کہ لکھتے لکھتے ابن جبیر کی بیاض پُر ہوجاتی تھی اور اُنہیں کپڑوں اور ہتھیلیوں پر لکھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔[1]

حضرت ابن عباس کے بعد اُنہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے فائدہ اُٹھایا۔ ابن جبیر قیام کوفہ کے زمانہ تک جب کہ وہ خود صاحب افتا ہوگئے تھے حضرت ابن عمرؓ سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں "جب کسی مسئلہ میں علمار کوفہ باہم مختلف ہوتے تھے تو میں اُس مسئلہ کو لکھ لیتا اور پھر حضرت ابن عمرؓ سے ملاقات ہوتی تو اُسے دریافت کرلیتا تھا"۔[2]

علم وفضل | ان اساتذۂ کرام کے فیض خاص اور سعید بن جبیر کی محنت و توجہ اور ذوق و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید تفسیر، حدیث، فقہ اور فرائض میں امام و شیخ بن گئے اور اقلیم شہرت و عظمت کے تاجدار بن کر نمودار ہوئے۔ امام نووی فرماتے ہیں "سعید بن جبیر تابعین کے ائمۂ کبار میں سے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور عبادت اور دوسری صفات خیر میں اُن کے مشیر و بزرگوں میں سے تھے"۔[3] میمون بن مہران کہتے ہیں "سعید بن جبیر کا انتقال ہوگیا اور آج زمین پر کوئی ایک شخص ایسا نہیں ہے جو اُن کے علم کا محتاج نہ ہو"۔ اشعث بن قیس کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر کو جہبذ العلماء (رئیس العلما) کہا جاتا تھا۔[4]

تفسیر | حضرت سعید کو ابن عباسؓ سے شرف تلمذ حاصل تھا جو قرآن مجید کے بہترین ترجمان تھے اِس بنار پر اُن کو بھی تفسیر و تاویل اور شانِ نزول کے علم میں بڑا کمال حاصل تھا جب اُن کے سامنے کوئی آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ اُس کا مصداق فوراً بتا دیا کرتے تھے۔ ابو یونس قزی کہتے ہیں "میں نے ایک دفعہ سعید بن جبیر کے سامنے یہ آیت پڑھی:-

[1] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹ - [2] ایضاً - [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶ - [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ -

الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان — مگر کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے

اُنہوں نے کہا " اس میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ مکہ کے چند ستم رسیدہ تھے"، میں نے کہا " میں ایسے ہی لوگوں (حجاج کے ستم رسیدہ) کے پاس سے آرہا ہوں"۔ سعید بولے " بھتیجے! ہم لوگوں نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی، لیکن کیا کیا جائے، خدا کی مرضی یہی تھی"۔ اعمش فرماتے ہیں " سعید بن جُبیر سے کسی نے ان ارضی واسعۃ کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا " اس سے مُراد یہ ہے کہ جب اُس میں گُناہ کیا جائے تو اُس سے نکل جاؤ[۴]"۔

تفسیر میں احتیاط | تفسیر کا درس زبانی دیتے تھے، اور یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص اُس کو قلمبند کرے۔ ایک شخص اُن کے پاس آیا، اور تقریر قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا، میرے ایک پہلو پر فالج گر پڑے، یہ بہتر ہے اس سے کہ میں تقریر لکھنے کی اجازت دیدوں[۵]۔ مگر خاص خاص اہل ذوق کو لکھنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ چنانچہ وقار بن ایاس بیان کرتے ہیں " عزرہ تفسیر کی کتاب اور دوات لے کر حضرت ابنِ جبیر کے پاس آتے تھے[۶]"۔

قرأت | تفسیر کے ساتھ قرأت میں بھی کمال رکھتے تھے۔ رمضان میں امامت خود ہی کرتے تھے۔ مشہور قرأتوں کا علم حاصل تھا۔ ایک رات حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت اور دوسری شب حضرت زید بن ثابت کی قرأت پڑھتے تھے[۷]۔

حدیث | حدیث کے اکابر حفاظ میں سے تھے، اجلّہ صحابہ سے حدیث کا سماع کیا تھا حضرت ابن عباس کے تلمیذِ خاص تھے جو اُن پر خاص شفقت کی نگاہ رکھتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس نے سعید سے کہا " حدیثیں سناؤ" اُنہوں نے عرض کیا " میں آپ کی موجودگی میں حدیث کس طرح سنا سکتا

---

[۴] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳ [۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [۶] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۴ [۷] شذرات الذہب

ہوں ؟" ابن عباس رض نے فرمایا "کیا یہ خدا کی نعمت نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو، اگر صحیح بیان کروگے تو فبہا، ورنہ میں اس کی تصحیح کردوں گا"۔[1] بنی دواعہ کے مؤذن کا بیان ہے "میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رض کے پاس گیا وہ ایک گدی پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اور سعید اُن کے پیروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس اُن سے فرمارہے تھے "تم نے مجھ سے بہتیری حدیثیں یاد کی ہیں اب دیکھوں اُن کو کیسے روایت کرتے ہو"۔[2]

روایت حدیث میں احتیاط مگر کبار حفاظ حدیث میں ہونے کے باوجود روایت کے معاملہ میں محتاط تھے موقع دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ محمد بن حبیب کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر اصفہان میں تھے تو لوگوں نے روایت حدیث کی درخواست کی، مگر اُنہوں نے اُسے منظور نہیں کیا۔ پھر جب کوفہ میں آئے تو احادیث بیان کرنے لگے کسی نے اُن سے پوچھا "اے ابو محمد! آپ اصفہان میں تو حدیث بیان کرتے نہیں تھے کوفہ میں آکر حدیثیں کس طرح بیان کرنے لگے"، فرمایا "انشر بزک حیث یعرف"۔ تم اپنے تھان وہاں کھولو جہاں اُس کو پہچاننے والے موجود ہوں[3]۔

فقہ قرآن وحدیث میں بصیرتِ تامہ رکھنے کی وجہ سے اُنہیں فقہ میں بھی امامت کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت ابن عباس کے سامنے اُنہیں فتویٰ دینے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، مگر جب وہ نابینا ہوگئے تو حضرت سعید بن جبیر لکھنے لگے[4]۔ خود حضرت ابن عباس کو اتنا اعتماد تھا کہ اہل کوفہ حج کرنے آتے، اور مکہ میں حضرت ابن عباس سے مسائل دریافت کرتے تو وہ فرماتے "کیا تم میں سعید بن جبیر نہیں ہیں"۔ امام نووی نے اُن کو جہاں تفسیر و حدیث میں کبار ائمۃ التابعین میں شمار کیا ہے، فقہ میں بھی کیا ہے۔ خصیب کا بیان ہے "مسائل طلاق کے سب سے بڑے عالم سعید بن المسیب

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴

تھے۔ حج کے عطار، حرام و حلال کے طاؤس، تفسیر کے مجاہد اور ان سب کے جامع سعید بن جبیر تھے[1]

فرائض | فرائض میں خاص ملکہ تھا۔ جلیل القدر صحابہ فرائض کے سائلوں کو اُن کے پاس بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اسی قسم کا سائل آیا۔ آپ نے اس کو سعید بن جبیر کے پاس بھیج دیا، اور فرمایا "فرائض کا علم جتنا مجھکو ہے اُن کو بھی ہے۔ مگر وہ حساب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں[2]۔ جب کبھی مدینہ تشریف لیجاتے۔ علماء مدینہ اُن سے فرائض سیکھتے تھے۔ امام زین العابدین کا بیان ہے کہ ابن جبیر ہمارے یہاں سے گذرتے تو ہم اُن سے فرائض اور وہ باتیں دریافت کرتے تھے جن سے خدا نے ہم کو فائدہ پہنچایا[3]۔

اشاعت علم کا شوق | حضرت سعید ابن جبیر کے سینہ میں علم و فضل کا جو خزانہ ودیعت تھا انہوں نے حسب موقع و مصلحت اُس کو شائع کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ بعض لوگ آپ کو حدیث بیان کرنے پر ملامت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا "میں تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے حدیث بیان کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ میں اُسے قبر میں ساتھ لیجاؤں[4]۔"

تلامذہ | شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس میں بعض اکابر امت ہوئے ہیں۔ چند بزرگوں کے نام یہ ہیں: عبدالملک، عبداللہ، یعلی بن حکیم، یعلی بن مسلم، ابو اسحٰق سبیعی، ابو الزبیر مکی، آدم بن سلیمان، اشعث بن ابی الشعثا، ذر بن عبداللہ، سالم الافطس، مسلمہ بن کہیل، طلحہ بن مصرف، عطا بن السائب۔ عبدالملک بن سلیمان، مغیرہ بن النعمان وغیرہ[5]۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۰ [3] ایضاً [4] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲

مشیر کاری قضاء | کوفہ میں کچھ دنوں تک عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے اور پھر اُن کے بعد ابو بردہ ابن ابی موسیٰ اشعری کے پیش کار رہے[1]۔

تقویٰ | ان تمام علمی کمالات کے ساتھ زہد و اتقاء میں بھی درجۂ امتیاز رکھتے تھے خشیتِ ربانی حد سے بڑھا ہوا تھا، سوز و گدازِ قلب جو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ قاسم ابن ابی ایوب کہتے ہیں "سعید بن جبیر رات رات بھر روتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں چندھیاہٹ پیدا ہوگئی تھی[2]" مزید فرماتے ہیں کہ میں نے اُن کو ایک مرتبہ دیکھا کہ آیت :۔

واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ	تم ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے

پڑھ رہے تھے اور روتے جاتے تھے[3]۔

غیبت کرنا اور سُننا دونوں سے سخت احتراز کرتے تھے۔ مسلم البطین کہتے ہیں "سعید اپنے روبرو کسی کو غیبت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ اُس کو فرماتے "جو کچھ تم کو کہنا ہے اُس کے سامنے کہو"۔

نماز میں خشوع | نماز نہایت خشوع سے ادا کرتے تھے۔ کبھی اُس میں اس قدر انہماک ہوتا کہ ایک رکعت میں ہی تمام قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ عبدالملک بن سلیمان بیان کرتے ہیں کہ دو رکعتوں میں قرآن مجید ختم کر دیا کرتے تھے[4]۔

ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے کہ یہ آیت :۔

اِذِ الاغلال فی اعناقھم و	جبکہ طوق اُن کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں
السلاسل یسحبون فی الحمیم	اور وہ گرم پانی پینے کے لئے گھسیٹے جاتے ہونگے

آگئی، اتنی رقت طاری ہوئی کہ اس کو بار بار دہراتے رہے[5]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ - [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲

[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ - [5] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۱ -

دعا میں اثر | اُن کے اِن اعمالِ نیک کا ہی ثمرہ تھا کہ اُن کی دعا میں بڑی تاثیر تھی۔ اُن کے ہاں ایک مُرغ تھا جو رات کو بانگ دے کر اُنہیں بیدار کر دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک رات اُس نے بانگ نہیں دی، حضرت سعید بن جبیر کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ صبح تک پڑے سوتے رہے، صبح کو اُٹھے تو اُنہیں شب کا بیدار نہ ہونا بہت بُرا معلوم ہوا غصہ میں فرمانے لگے "اس مُرغ کو کیا ہو گیا تھا، اللہ اس کی آواز کو ختم کر دے" اُن کا یہ کہنا تیر بہدف ہوا اور اُس مرغ نے پھر دوبارہ کبھی بانگ نہیں دی۔ اُن کی والدہ نے فرمایا "اب آئندہ سے کبھی کسی کے حق میں بد دُعا نہ کرنا"[1]

علماءِ سُوء سے اجتناب | علماءِ سوء کو نہایت بُرا جانتے تھے اور اُنہیں مسلمانوں کے لئے خطرۂ عظیم سمجھتے تھے ہلال بن خباب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا "لوگوں کی ہلاکت کس وجہ سے ہوگی؟" فرمایا: اُن کے علماء کے ہاتھوں[2]

سیر و سیاحت اور قضاءِ کوفہ | ابن جبیر کو سیر و سیاحت کا شوق تھا، ایک عرصہ تک مدینہ رہے، یہاں سے اصفہان چلے گئے اور وہاں ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد عراق آ گئے۔ مختلف شہروں میں پھرنے کے بعد ایک گاؤں سنبلان میں اقامت اختیار کر لی[3]۔ حجاج بن یوسف ان کے علم و فضل کی قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے کوفہ کا امام اور قاضی مقرر کر دیا۔ لیکن کوفہ کے لوگ نہایت شورہ پشت تھے، کسی کی گورنری سے خوش ہی نہیں ہوتے تھے۔ حسب عادت ابن جبیر کے خلاف بھی شور و غل مچایا اور کہا "ہمارا حاکم تو کوئی عربی ہی ہونا چاہئے" مجبوراً حجاج کو انہیں عہدۂ قضا سے برطرف کرنا پڑا۔ ان کی بجائے ابوبردہ بن ابی موسیٰ اشعری کوفہ کے قاضی مقرر کر دئے گئے مگر حجاج نے تاکید کر دی تھی کہ ابن جبیر سے امورِ قضاء میں مشورے لیتے رہنا[4]

حجاج کی مخالفت | حجاج حضرت ابن جبیر کی ہر طرح عزت افزائی کرتا تھا، لیکن وہ اس سے

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [4] ایضاً

متاثر نہیں ہوتے تھے اور اس کی بے پناہ سفاکیوں کو انتہائی نفرت و غصہ کی نگاہ سے دیکھتے۔ چنانچہ جب ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث نے حجاج کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا تو ابن جبیر اُس کے ساتھ ہو کر حجاج سے لڑے۔

تاریخ میں حجاج و ابن اشعث کی مخالفت کا واقعہ مشہور ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے کہ عبدالملک کے عہد میں سجستان کے فرمانروا رتبیل نے باغیانہ روش اختیار کر لی تھی۔ حجاج نے عبیداللہ ابن ابو بکرہ کو ایک لشکر کے ساتھ اُس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، اُنہوں نے سیستان پہنچ کر فوج کشی کی۔ شروع شروع میں اُنہیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی مگر بعد میں شکست ہو گئی جس کے باعث مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ حجاج کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اُس نے ابن اشعث کی زیر سرکردگی چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار بڑے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا۔ اس لشکر میں بیس ہزار سپاہی کوفہ کے تھے اور بیس ہزار بصرہ کے۔ حضرت سعید ابن جبیر بھی اس فوج میں شریک تھے۔ ان کے سپرد تنخواہ تقسیم کرنے کی خدمت تھی[1]۔

ابن اشعث اس فوجِ گراں کو لئے بڑھتے رہے۔ رتبیل کو اس کی اطلاع ہوئی، تو اُس نے نامہ و پیام کے ذریعہ مصالحت کرنی چاہی اور پہلی دفعہ مسلمانوں کو اُس کے ہاتھ سے جو نقصان پہنچا تھا اُس کی معذرت کی، مگر ابن اشعث نے ایک نہیں سنی۔ اُنہوں نے حدودِ سیستان میں داخل ہو کر کئی علاقے فتح کر لئے مگر بعض مصلحتوں کے پیش نظر مزید پیش قدمی ایک سال کے لئے ملتوی کر دی اور حجاج کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع بھی دیدی۔ حجاج خط پڑھ کر برافروختہ ہو گیا، اور اُس نے جواب میں لکھا "تمہارا خط اُس شخص کا سا خط ہے جو اغماض و صلح کو پسند کرتا ہے اور دشمن سے سمجھوتہ کر کے آرام کرنے کا خواہشمند ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے یہ خط کسی مکاری کی بنا

---

[1] ابن جریر طبری ج ۸، ص ۹۳۔

پر لکھا ہے"۔ البتہ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم نے یہ رائے اپنے ضعف اور سہل انگاری کی بنا پر قائم کی ہے"۔ اس خط کے بعد ایک اور خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ اگر تم خود پیشقدمی نہیں کر سکتے تو اپنے بھائی اسحٰق بن محمد کو لشکر کی قیادت سپرد کر دو، اور تم الگ ہو جاؤ۔ ابن اشعث اور حجاج میں پہلے سے مخالفت تھی اور دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس خط نے دل میں چھپی ہوئی بدگمانی کو بے نقاب کر دیا۔ ابن اشعث اس کو پڑھتے ہی بگڑ گیا اور اس نے وہیں ایک مجمع کر کے لوگوں کو حجاج کی مخالفت پر اُبھارا، اہلِ فوج حجاج کے مظالم سے پہلے ہی نالاں تھے بڑے بڑے سردار اُس کے حامی ہو گئے۔ شروع میں یہ مخالفت صرف حجاج کے ساتھ تھی لیکن بعد میں اُس نے عبد الملک کی مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ ابن اشعث اپنے حامیوں کی جماعت لئے ہوئے عراق پہنچا، ادھر حجاج نے ایک فوجِ گراں کے ساتھ ابن اشعث کے مقابلہ کے لئے عراق سے کوچ کیا، دو ماہ تک جنگ ہوتی رہی، ابن اشعث کے ساتھ بہت سے علماء اور قرآء تھے جن کے سرگروہ سعید بن جبیر تھے۔

ابن اشعث کی شکست

ابتداءً ابن اشعث کی قوت مضبوط تھی، مگر جب مقابلہ کی زد پر حکومت بھی آگئی تو اس کا زور گھٹ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دیر جماجم میں شکستِ فاش کھانی پڑی ابن اشعث تو بھاگ کر سیستان چلا گیا، ابن جبیر پھرتے پھراتے مکہ چلے آئے۔ یہاں کے والی خالد بن عبد اللہ قشری نے گرفتار کر کے اُنہیں حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا[1]۔ انہیں دیکھتے ہی غیظ و غضب سے بے قابو ہو گیا، پھر دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

حجاج:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

سعید:۔ سعید بن جبیر۔

---

[1] ابن جریر طبری ج ۸ ص ۱۰۷۸ ملخصاً

حجاج :- نہیں! بلکہ شقی بن کسیر۔

ابن جُبیر :- میری ماں بہ نسبت تمہارے میرے نام سے زیادہ واقف تھیں۔

حجاج :- وہ بھی بدبخت اور تم بھی بدبخت ہو۔

ابن جبیر :- غیب کا علم کسی دوسری ہی ذات کو ہے۔

حجاج :- میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔

ابن جبیر :- اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تم کو معبود بنا لیتا۔

حجاج :- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

ابن جُبیر :- وہ امامِ ہدیٰ اور نبیِ رحمت تھے۔

حجاج :- علی اور عثمان کے بارہ میں کیا رائے ہے؟

ابن جُبیر :- اگر میں وہاں گیا ہوتا اور وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا ہوتا تو بتا سکتا تھا۔

حجاج :- خلفا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

ابن جبیر :- میں اُن کا اجارہ دار نہیں ہوں۔

حجاج :- اُن میں تم کو سب سے زیادہ پسند کون ہے؟

ابن جبیر :- جو میرے خالق کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

حجاج :- خالق کے نزدیک کون سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟

ابن جُبیر :- اُس کا علم اُس ذات کو ہے جو اُن کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے۔

حجاج :- میں چاہتا ہوں کہ تم میری تصدیق کرو۔

ابن جُبیر :- اگر میں تم کو محبوب رکھتا تو ہرگز تمہاری تکذیب نہ کرتا۔

حجاج :- تمہیں کیا ہوگیا کہ ہنستے نہیں ہو۔

ابن جُبیر :- وہ مخلوق کس طرح ہنسے جو مٹی سے پیدا کی گئی ہے، حالانکہ مٹی کو آگ کھا جاتی ہے۔

حجاج :- پھر ہم کیوں ہنستے ہیں؟

ابن جبیر:۔ سب دل برابر نہیں ہیں!

اِس کے بعد حجاج نے موتی، زبرجد اور یاقوت منگوائے اور ان سب کو اپنے سامنے جمع کیا۔ حضرت ابن جبیر بولے "اگر تم نے ان چیزوں کو اس لئے جمع کیا ہے کہ ان کے ذریعہ روزِ قیامت کے خوف سے بچ جاؤ تو درست ہے، ورنہ یاد رکھو قیامت کا ایک جھٹکا دودھ پلانے والی عورتوں کو اُن کے شیر خوار بچوں سے غافل کردیگا اور جو چیزیں دنیا کے لئے جمع کی جائیں اُن میں صرف وہ ہی عمدہ اور پسندیدہ چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور طیب ہوں۔" اس کے بعد حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ ابن جبیر بانسری کی آواز سُن کر رو پڑے۔ حجاج بولا "اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو ایک تفریحی چیز ہے۔" ابن جُبیر نے کہا "نہیں! یہ تو ایک صدائے غم ہے، بانسری کے بجنے نے مجھ کو وہ بڑا دن یاد دلادیا جبکہ صور پھونکا جائے گا، اور عود ایک ناحق کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے اور اس کے تار اُن بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو اُن کے ساتھ قیامت کے دن اُٹھائی جائینگی۔" اس گفتگو کے بعد حجاج بولا "سعید! تمہاری حالت قابلِ افسوس ہے" ابن جُبیر نے جواب دیا "وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے جو آگ سے نجات پاگیا ہو، اور جنت میں داخل کردیا گیا ہو۔" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حجاج:۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم کوفہ میں آئے جبکہ وہاں ایک شخص بھی غیر عربی نہیں تھا اور میں نے تم کو وہاں کا امام و قاضی بنایا؟

سعید:۔ کیوں نہیں!

حجاج:۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ تمہارے عہدۂ قضاء پر مامور ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ نے شور و غل مچایا اور مطالبہ کیا کہ ہمارا قاضی عربی النسل ہونا چاہئے۔ تو میں نے تمہاری بجائے ابوبردہ ابن ابی موسیٰ اشعری کو قاضی بنادیا، مگر ساتھ ہی ہدایت کردی کہ وہ تمہارے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں؟

ابن جبیر:۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے۔

حجاج:۔ کیا میں نے تم کو اپنا ندیمِ خاص نہیں بنایا، حالانکہ میرے خاص اہلِ مجلس سب عرب کے بڑے بڑے سردار تھے؟ ۔ **ابن جُبیر:۔** یہ بھی درست ہے۔

حجاج:۔ کیا میں نے پہلی ہی ملاقات میں تم کو ایک لاکھ کی بیش قرار رقم نہیں دی کہ تم اُس کو اربابِ ضرورت پر خرچ کرو۔ پھر میں نے تم سے اس کا کوئی حساب بھی نہیں مانگا؟

ابن جُبیر:۔ بیشک یہ بھی بجا ہے۔

حجاج:۔ پھر (اِن احسانات کے باوجود) تم کو میری مخالفت پر کس چیز نے آمادہ کیا؟

ابن جبیر:۔ عبدالرحمٰن بن اشعث کی بیعت نے جس کا طوق میری گردن میں تھا۔

حجاج یہ سُن کر قابو سے باہر ہوگیا، اور کہنے لگا "کیا پہلے سے امیر المومنین عبدالملک کی بیعت کا طوق تمہاری گردن میں نہیں تھا، بخدا! اب میں تم کو قتل کئے بغیر نہیں رہونگا۔

ابن جبیر:۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو وقت مقرر کر دیا ہے، میں اُس پر ضرور اُس کے پاس پہنچوں گا۔

حجاج نے جلادوں کو حکم دیا کہ ان کو لیجاؤ اور قتل کر دو۔ اس پر ابن جبیر نے کلمۂ تشہد پڑھا اور کہا "اے حجاج اس کو میری طرف سے یاد کر لو، تا آنکہ حشر میں میری اور تمہاری پھر ملاقات ہو جلاد ابن جبیر کو لے کر چلنے لگے تو اُنہیں ہنسی آگئی۔ حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو پوچھا "تمہیں ہنسی کیوں آئی؟" بولے "اللہ کے خلاف تیری جرأت اور تیرے متعلق اللہ کی شانِ بردباری دیکھ کر!" انھوں نے یہ کہہ کر قبلہ کی طرف رُخ کیا اور پڑھا اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ حجاج ابن جبیر کا قبلہ رو ہونا بھی برداشت نہیں کر سکا۔ حکم دیا "قبلہ سے اُن کا رُخ پھیر دو" فرمایا:۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔	تم جس طرف بھی اپنا رخ کرو گے اللہ اُدھر ہی ہوگا، بیشک اللہ وسیع اور علیم ہے

[1] یہ واقعہ طبری ج ۸، ابن اثیر ج ۴ اور ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ - ۲۰۶ میں اسی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے ہم نے موقع و محل گفتگو کے پیش نظر کسی قدر تفصیل بدل دی ہے۔

حجاج نے حکم دیا "انہیں زمین کے بل لٹا دو" ابن جبیر نے پڑھا:۔

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَ — ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں

مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ۔ — تم کو لوٹا دینگے، اور پھر دوسری مرتبہ اسی سے نکالینگے۔

غیر معمولی استقامت

آخر امر حجاج نے حکم دیا کہ "قتل کر دیے جائیں" یہ حکم سُن کر ایک شخص رونے لگا۔ ابن جُبیر نے پوچھا "کیوں روتے ہو؟" وہ بولا "آپ کے قتل پر" فرمایا "اس پر رونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کو یہ واقعہ پہلے سے معلوم ہے، پھر یہ آیت پڑھی:۔

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ — زمین میں یا تمہارے نفسوں پر جو مصیبتیں نازل

وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ — ہوتی ہیں، وہ سب کتاب میں اُن کے پیدا

قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا — کرنے سے پہلے لکھ دی گئی تھیں۔

عمر بن سعید کہتے ہیں کہ ابن جبیرؒ نے مقتل میں جانے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو بلایا، وہ آئے تو باپ کو دیکھ کر رونے لگے۔ حضرت ابن جبیر نے فرمایا "بیٹے! روتے کیوں ہو؟ تمہارے باپ کی عمر ستاون سال کی تو ہو گئی، اب اس کے بعد زندہ رہنا کیا ضروری تھا"

قتل ہونے کا وقت قریب آیا تو حجاج نے پھر پوچھا "بولئے آپ کس کروٹ قتل ہونا چاہتے ہیں" فرمایا "قصاص تیرے سامنے ہے، جیسا کریگا ویسا پائیگا۔ اب جس طرح تو پسند کرے کر" جلاد شمشیر برہنہ لئے ہوئے پہلے سے موجود تھا۔ حجاج کی زبان سے قتل کا حکم نکلنا تھا کہ جلاد کی تلوار دفعتہً ابن جبیرؒ کے سر پر چمکی اور عشقِ الٰہی کے سودا سے بھرا ہوا سر کلمۂ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتا ہوا زمین پر آگرا۔

شہادت کے بعد کے حالات

قتل ہونے سے پہلے حضرت ابن جبیر نے دعاء کی تھی "اے اللہ میرے بعد تو حجاج کو کسی پر مسلط نہ کر کہ وہ اس کو قتل کر سکے" یہ دعا مقبول ہوئی، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ابن جبیر کی شہادت کے چھ ماہ بعد حجاج بھی مر گیا، اور ان چھ مہینوں میں کسی اور کو قتل نہ کر سکا، شہادت کے وقت ایک عجیب واقعہ یہ بھی پیش آیا

کہ حضرت ابن جبیرؒ کے جسم سے عام مقتولوں کے برخلاف خون زیادہ نکلا، یہاں تک کہ بہہ کر حجاج کے جائے نشست کے نیچے آگیا۔ حجاج کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے فوراً اطبار کو بلا کر وجہ دریافت کی۔ اُنہوں نے کہا "خون، روح کے تابع ہوتا ہے، تم نے اُس سے پہلے جن لوگوں کو قتل کیا ہے خوف و دہشت کی وجہ سے اُن کی روح پہلے ہی پرواز کر چکی تھی، پھر اُن میں خون کہاں سے آتا؛ لیکن ابن جبیرؒ کا معاملہ ان کے برعکس تھا، اُن پر خوف و دہشت طاری نہیں ہوئی اور قتل کے وقت روح اُن کے اندر موجود تھی[1]۔

یہ واقعۂ شہادت شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا۔ سمعانی کے نزدیک اُس وقت اُن کی عمر ترپن سال کی، اور ابن قتیبہ کی رائے میں اُنچاس سال کی تھی[2]۔

حجاج پر اثر حضرت ابن جبیرؒ کا خونِ ناحق رنگ لایا، اور حجاج پر عرصۂ زیست تنگ ہو گیا۔ حجاج مرض الموت میں مبتلا تھا کہ خواب میں اُنہیں دیکھا کہ اُس کے کپڑے پکڑ کے کھینچ رہے ہیں اور کہتے ہیں "اے دشمنِ خدا! تو نے مجھ کو کیوں قتل کیا تھا" حجاج یہ خواب دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اور آنکھ کھلی تو اُس وقت بھی اُس کا بدن خوف سے کانپ رہا تھا، اُس پر بار بار سکرات الموت طاری ہوتے تھے اور جب ذرا ہوش آتا تھا تو کہتا تھا "میں اپنے اور ابن جبیرؒ کے معاملہ کو کیا کروں؟ اسی طرح کا ایک وحشت انگیز خواب عبدالملک نے بھی دیکھا تھا[3]۔

حسن بصریؒ پر اثر حضرت ابن جبیرؒ کے اس قتلِ ناحق نے اکابر تابعین میں غم و ماتم کی صفیں بچھا دیں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا "اے خدا! ثقیف کے فاسق (حجاج) سے اس کا انتقام لے۔ خدا کی قسم اگر تمام روئے زمین کے رہنے والے ان کے قتل میں شریک ہوتے تب بھی خدا اُن کو مُنہ کے بل دوزخ میں جھونک دیتا[4]۔

مزار حضرت سعیدؒ کا مزار شہر واسط میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے، جہاں اُن کا جسم مبارک سپردِ خاک کر دیا گیا تھا، لوگ اُس سے برکت حاصل کرتے ہیں[5]۔

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۶۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶۔ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۶۔ [4] ایضاً۔ [5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱۰

حلیہ حلیہ یہ تھا رنگ سیاہ، سر اور ڈاڑھی دونوں سپید، خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے،[1] عمامہ باندھتے تھے اور پیچھے کی جانب ایک بالشت شملہ چھوڑ دیا کرتے تھے[2]

اولاد اولاد میں تین لڑکے تھے۔ عبداللہ، محمد اور عبدالملک تھے[3]

---

[1] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۰۔ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۸

سلیمان بن یسار

نام ونسب | سلیمان نام، ابوایوب کنیت۔ اُم المومنین حضرت میمونہ کے غلام تھے۔ انہوں نے اُن کو مکاتب کر دیا تھا۔ اس غلامی کے توسل سے اُن کو حرم نبوی میں آنے جانے کا شرف حاصل تھا۔ جب تک آزاد نہیں ہو گئے ازواجِ مطہرات نے اُن سے پردہ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں، میں نے ایک دفعہ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ نے آواز پہچان کر فرمایا "تم نے بدلِ کتابت ادا کر دیا؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں! ابھی تھوڑا سا باقی ہے"۔ ارشاد ہوا "اندر چلے آؤ۔ جب تک تمہارے ذمہ کچھ بھی باقی ہے تم غلام رہو گے"۔[1]

فضل وکمال | حضرت سلیمان خداداد ذہانت وجوہرِ قابل رکھتے تھے۔ پھر خانوادۂ نبوت میں بود وباش نے اُن کے جوہر کو اور چمکا دیا تھا۔ اس بنا پر وہ مدینہ کے ممتاز ترین علماء میں ہو گئے۔ ابن سعد فرماتے ہیں "وہ ثقہ عالم، بلند مرتبت فقیہ، کثیر الحدیث تھے، اور لوگوں کا اُن کی جلالتِ شان وکثرتِ علم پر اتفاق ہے، اُن کا شمار مدینہ کے فقہاءِ سبعہ میں ہوتا تھا۔ ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں "سلیمان بن یسار مدنی ثقہ، قابلِ اعتماد واعتبار اور فاضل وعابد تھے۔

قرأت | حضرت سلیمانؒ کو تمام علوم دینیہ، قرآن، حدیث، فقہ میں کمال حاصل تھا، مدینہ کے مشہور قرا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وکان من فقہاء المدینۃ وقرائھم[1] — حضرت سلیمان مدینہ کے فقہا اور قرا میں سے تھے

فقہ | قرأت کی طرح فقہ میں بھی کمال تھا" اس میں اُن کو امامت واجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان من ائمۃ الاجتھاد" وہ اجتہاد کے اماموں میں سے تھے۔[2]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۵

سعید بن المسیبؒ عہد تابعین کے نامور فقیہ تھے، مگر اُن کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو وہ اُس کو حضرت سلیمان کے پاس بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے "آج جو علماء باقی رہ گئے ہیں سلیمان بن یسار اُن سب میں بڑے عالم ہیں" امام نسائیؒ نے ان کو امام تسلیم کیا ہے۔ محمد بن حنفیہؒ کے صاحبزادے حسن فرماتے تھے "سلیمان ابن یسار ابن مسیب سے زیادہ سمجھدار (افہم) ہیں"۔ ابوالزناد فرماتے تھے "سلیمان ان سات فقہاء میں سے ہیں جو ارباب فقہہ وصلاح اور اصحابِ فضل ہیں"[1]۔ امام مالک نے اُن کا مرتبہ حضرت ابنِ مسیب کے بعد تسلیم کیا ہے۔

مسائل طلاق کے بہترین عالم تھے۔ قتادہ کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ مدینہ گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں مسائل طلاق کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اُنہوں نے سلیمان بن یسار کا نام بتایا[2]۔

حدیث| حضرت سلیمان جس خانۂ اقدس کی غلامی کا شرف رکھتے تھے وہ حدیث کا سرچشمہ تھا اس لئے قدرتی طور پر وہ اس سے زیادہ سیراب ہوئے۔ چنانچہ علامہ ابن سعد ان کو "کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔ ابوزرعہ بھی اُنہیں "ثقہ" کہتے ہیں اُن کے خاص اساتذہ حسب ذیل ہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ و حضرت میمونہ، حضرت ام سلمہ، فاطمہ بنت قیس، حمزہ بن عمرو الاسلمی، زید بن ثابت، ابن عباس، ابن عمر، جابر، مقداد بن اسود۔ ابورافع، ابوسعید، ابوہریرہ، ربیع بنت معوذ، سلمہ بن صخر، فضل بن عباس۔

تلامذہ| تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

عمرو بن دینار، عبداللہ بن دینار، عبداللہ بن الفضل، ابوالزناد، سالم ابوالنضر، صالح بن کیسان، عمرو بن میمون، محمد بن ابی حرملہ، زہری۔ مکحول، نافع مولیٰ ابن عمر، یحیی بن سعید انصاری، یعلی بن حکیم، یونس بن سیف وغیرہ[3]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹۔ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۸۔ ۲۲۹۔

زہد واتقاء | ان علمی خوبیوں کے باوجود عمل وروح کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام کے مالک تھے۔ ابوزرعہ کا مقولہ گذر چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ سلیمان بن یسار مدینہ کے فاضل اور زاہد ومتقی تھے۔ عجلی فرماتے تھے:۔

مَدَنی تابعی ثقۃٌ مامونٌ فاضلٌ عَابِدٌ [1]

وہ مدنی تھے، تابعی، معتمد ومعتبر، مامون فاضل، اور عبادت گذار

تمام فضائلِ اخلاق کا منبع خشیت ربانی ہے، یہ اُس سے بھرپور تھے مصعب بن عثمان فرماتے ہیں "سلیمان بہترین خوش رو نوجوان تھے ایک مرتبہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اپنی باتوں سے اُن کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا، حضرت سلیمان نے اُس کی مقاومت کی اور گھر سے نکل کر بھاگ گئے" [2]

حضرت میمونہ نے اپنا ولاء حضرت ابن عباس کو مرحمت کر دیا تھا۔

وفات | زمانہ وفات کے متعلق بڑا اختلاف ہے۔ غالب یہ ہے کہ سنہ ۱۰۷ھ میں وفات پائی جبکہ اُن کی عمر تہتر سال کی تھی۔ [3]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۳۰ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۵ - [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹

حضرت مجاہد بن جبیر

نام ونسب | مجاہد نام، ابوالحجاج کنیت۔ عبداللہ بن ابی السائب المخزومی کے غلام تھے۔[۱]
حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ۲۱ھ میں پیدا ہوئے[۲]

فضل وکمال | حضرت مجاہد غلام تھے مگر علم وفضل کے مہرِ درخشاں تھے، امام نووی لکھتے ہیں "وہ تابعی امام ہیں، اور ان کی جلالت و امامت پر سب کا اتفاق ہے[۳]۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان احد اوعیۃ العلم وہ علم کا ایک ظرف تھے[۴]" علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "وکان فقیھا عالما ثقۃ کثیر الحدیث" وہ فقیہ عالم، معتبر اور کثیر الحدیث تھے[۵]۔ تفسیر، حدیث اور فقہ ان سب میں کمال حاصل تھا۔

تفسیر | انہوں نے حبرِ امت، ترجمان القرآن، حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر پڑھی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں نے ابن عباسؓ سے تیس[۳۰] مرتبہ قرآن پڑھا، ایک ایک آیت پر میں رکتا تھا اور اس کے شانِ نزول اور دوسرے امور سے متعلق سوال کرتا جاتا تھا" تعلیم کا شوق اتنا تھا کہ حضرت ابن عمرؓ کی رکاب پکڑ کر ہی کھڑے ہو جاتے، اور سوالات کرنے لگتے تھے[۶]۔ حضرت ابن عباسؓ وابن عمرؓ کی توجہِ خاص نے انہیں اپنے عہد کا بڑا مفسر بنا دیا۔ مصعب فرماتے ہیں۔

"کان اعلمھم بالتفسیر مجاھد وبالحج عطاء" تابعین میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد اور مسائل حج کے بڑے عالم عطاء تھے۔

قتادہ نے کہا "جو علماء باقی رہ گئے ہیں ان میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد

---

۱ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳ ۲ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴ ۳ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳۔
۴ ابن سعد ج ۵ ص ۴۶۶۔ ۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۶۔ ۶ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴

ہیں [۱] خصیف نے بھی اُن کو اعلمھم بالتفسیر تسلیم کیا ہے۔ حافظ ذہبی اُن کو "امام مفسر" لکھتے ہیں [۲] معلوم ہوتا ہے کہ اممِ سابقہ اور تاریخِ قدیم سے متعلق اہل کتاب سے بھی سوالات کرتے رہتے تھے، چنانچہ اعمش سے کسی نے پوچھا کہ لوگ تفسیرِ مجاہد کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟" فرمایا "اُن کا خیال ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھتے تھے۔ [۳]"

قرأت: تفسیر کے ساتھ فن قرأت کے بھی عالم تھے۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر اُن کو "مقری" لکھتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت سے واقف نہیں تھے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ "اگر میں نے ابنِ مسعود کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھا ہوتا تو مجھ کو بہت سے مواقع پر حضرت ابنِ عباسؓ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ [۴]"

حدیث: حدیث میں اُن کو حفاظ کا مرتبہ حاصل تھا۔ امام ذہبی اُن کو "حافظِ حدیث" اور امام نووی "امامِ حدیث" لکھتے ہیں۔ ابن سعد نے انہیں "کثیر الحدیث" لکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اُن کے حفظ کے اس درجہ معترف تھے کہ فرماتے تھے "کاش نافع (مولیٰ ابن عمرؓ) کا حفظ بھی تمہاری طرح ہوتا۔ [۵]"

مجاہد حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ اکابر صحابہ اس وقت موجود تھے، چنانچہ انہوں نے حضراتِ ذیل سے حدیث حاصل کی: حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، سعید ابن ابی وقاصؓ، رافع بن خدیجؓ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، جویریہ بنت الحارث، ام ہانیؓ۔ تابعین میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، طاؤس، عبداللہ بن السائب، عبداللہ بن سنجرہ، عبدالرحمٰن بن صفوان، عمر بن اسود، مورق العجلی وغیرہم سے تلمذ رکھتے تھے۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۔ [۴] ایضاً
[۵] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵۔

تلامذہ | اُن کے خوشہ چینانِ علم کا دائرہ وسیع تھا۔ جن میں لائق ذکر حسب ذیل حضرات ہیں
ایوب سختیانی، عطاء، عکرمہ، ابن عون، عمرو بن دینار، ابو اسحٰق سبیعی، ابو الزبیر
مکی، یونس بن ابی اسحاق، قتادہ، عبید اللہ بن ابی یزید، ابان بن صالح، سلیمان الاعمش،
سلیمان الاحول، مسلم البطین، طلحہ بن مصرف، عبد اللہ بن کثیر القاری[1]۔

فقہ | قرآن و حدیث میں بصیرت رکھنے کے باعث فقہ میں بھی امتیازِ خاص رکھتے تھے
چنانچہ ابن حبان فرماتے ہیں:۔

کان فقیھا ورعا عابدا متقنا — مجاہد فقیہ، پرہیز گار، عبادت گذار، اور پختہ علم والے تھے

امام نووی، حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی تینوں اُن کے تفقہ پر متفق ہیں۔ علامہ
ابن قیم نے مکہ کے مفتیانِ کرام کے جہاں نام گنائے ہیں وہاں مجاہد بن جبیر کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔

زہد و ورع | ان علمی کمالات کے ساتھ عملی فضائل و اخلاق کے بھی جامع تھے۔ ابن حبان
کا قول اوپر گذر چکا ہے، جس میں وہ مجاہد کو ورعًا عابدًا کہتے ہیں۔ اُن کے ہر کام میں خلوص
ہوتا تھا، سلمہ بن کہیل کہتے ہیں "میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اُس نے علم خالصًا لوجہ اللہ حاصل
کیا ہو، مگر عطاء، طاؤس اور مجاہد کو[3]۔

دنیا سے بے تعلقی | جس کو علم کی حقیقی لذت اور عبادتِ الٰہی کا ذوقِ لطیف میسر آجائے دنیا سے
اُسے کیا دلچسپی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہدؒ بھی بسا اوقات دنیوی علائق سے الگ
تھلگ رہنے کے باعث غمگین نظر آتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے "اُن سے کسی نے
غمگین رہنے کا سبب دریافت کیا" تو فرمایا "ایک مرتبہ حضرت ابن عباس نے میرا
ہاتھ پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام کر فرمایا" تم دنیا میں اس
طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راستہ عبور کرنے والا رہتا ہے[4]۔

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۔ [2] اعلام الموقعین جزء اول مطبع منیری ص ۱۹ [3] تہذیب التہذیب
ج ۱۰ ص ۴۳۔ [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۵۲۔

فصاحت و بلاغت کلام، نہایت فصیح و بلیغ اور شیریں ہوتا تھا۔ اعمش فرماتے ہیں کہ جب مجاہد بولتے تھے تو اُن کے مُنہ سے موتی برستے تھے۔[1]

وضع میں سادگی ظاہری زیبائش اور آرائش سے نفور تھے۔ اعمش فرماتے ہیں: میں مجاہد کو دیکھتا تھا، تو (اُن کی ظاہری حالت کے باعث) اُنہیں حقیر سمجھتا تھا، وہ اپنی ظاہری وضع سے ایک مالکِ خر معلوم ہوتے تھے جس کا گدھا گم ہوگیا ہو، اور وہ اُس کی وجہ سے غمگین بیٹھا ہو۔[2]

عجائبِ عالم کا شوق عجائباتِ عالم کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ جس کسی عجیب چیز کا ذکر سنتے تھے اُس کو دیکھنے جاتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے اُن کے چاہِ بابل پر جانے اور وہاں ہاروت و ماروت کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے،[3] ہمارے خیال میں اس روایت میں رنگینیِ عنوان کا بھی دخل ہے۔

وفات سنہ وفات میں روایات مختلف ہیں۔ ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ میں ٹھیک اُس وقت جبکہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز تھے، جاں جانِ آفریں کے سپرد کردی، وفات کے وقت عمر تراسی سال کی تھی۔[4]

۱؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷ ۳؎ ایضاً ص ۸۶ و ۸۷ ۴؎ ایضاً

عطاء بن ابی رباح

نام و نسب | عطا نام والد کا نام اسلم تھا اور ابو رباح کنیت ۔ خود حضرت عطاء کی کنیت ابو محمد تھی ۔ یمن کے ایک مقام جند میں ۲۷ھ میں پیدا ہوئے ۔ حضرت عثمان کی خلافت کا عہد تھا ، ابتدائی تربیت مکہ معظمہ میں ہوئی ۔ آل میسرہ بن ابی خثیم فہری کے غلام تھے ۔

فضل و کمال | فضل و کمال اور زہد و اتقاء کے لحاظ سے بڑے بلند مرتبت تابعی تھے ۔ ابن سعد فرماتے ہیں :۔

کان ثقۃ فقیہا عالما کثیر الحدیث[۱] — وہ بڑے معتبر فقیہ ، عالم اور کثیر الحدیث تھے

حافظ ابن حجر انہیں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں ۔

وکان من سادات التابعین فقہا وعلما وورعا وفضلا ۔[۲] — عطاء فقہ ، علم ، ورع اور فضل کی وجہ سے ساداتِ تابعین میں سے تھے ۔

علامہ نووی فرماتے ہیں " وہ مکہ کے مفتی اور مشہور امام تھے ، بڑے بڑے ائمہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے[۳] " امام احمد بن حنبل فرماتے تھے " علم کا خزانہ خدا اُسی کو دیتا ہے جسے محبوب رکھتا ہے ، اگر علم کسی کے ساتھ مخصوص ہوتا تو عالی نسب اُس کے زیادہ حقدار تھے ۔ مگر عطاء حبشی غلام تھے ۔ یزید بن حبیب نوبی ، حسن بصری اور ابن سیرین غلام تھے[۴] "

قرآن | حضرت عطاء ایک حبشی اور بدشکل غلام تھے ، لیکن وہ جن بزرگوں کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے اُنہوں نے اُن کو قرآن کی تفسیر ، حدیث اور فقہ ، غرض کہ تمام

---

۱ ابن سعد ۔ ج ۵ ص ۳۴۴ ۲ تہذیب التہذیب ج ۷ ، ص ۲۰۳ ۳ تہذیب الاسمار نووی ج ۱ ص ۳۳۳

۴ مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۵۸ ۔

متداولہ اسلامی علوم میں ماہر بنا دیا تھا، مگر قرآن کے ساتھ شغف زیادہ تھا۔ اس کا مستقل درس دیتے تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں اِنّہٗ کانَ یُعلّمُ الکتابَ[1]۔

حدیث: قرآن کی طرح حدیث کے بھی امام تھے، انہوں نے عبادلۂ اربعہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے اور دوسرے جلیل القدر صحابۂ کرام، حضرت معاویہ، اسامہ بن زید، جابر بن عبداللہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن السائب مخزومی، عقیل بن ابی طالب عمرو بن ابی سلمہ، رافع بن خدیج، ابو درداء، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، ام المومنین حضرت عائشہ، اور اُم ہانی اور ام سلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سماعِ حدیث کی تھی[2]۔

تلامذہ: ان کے دامانِ تربیت سے جو حضرات فیضیاب ہو کر نکلے اُن کی فہرست بڑی طویل ہے اُن میں زیادہ مشہور یہ ہیں:۔ ابو اسحٰق السبیعی، مجاہد، زہری، اعمش، اوزاعی، ابن جریج، عمرو بن دینار، ابن اسحاق، یزید بن ابی حبیب، سلمہ بن کہیل، امام ابو حنیفہ، عبدالملک بن ابی سلیمان، قتادہ[3]۔

احترام حدیث: سماع و درس کے وقت حدیث کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حدیث کی روایت کے درمیان میں اگر کوئی بولتا تھا تو سخت ناگوار گذرتا تھا۔ معاذ بن سعید الاعور کہتے ہیں: ایک مرتبہ ہم حضرت عطاء کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے کوئی حدیث بیان کرنی شروع کی، درمیان میں ایک شخص نے اُس کو ٹوک دیا۔ عطاء کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا، فرمایا "یہ کیا اخلاق ہیں یہ کیسی طبیعتیں ہیں، بخدا بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو اگرچہ میں اُس کا اُس سے زیادہ عالم ہوتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے وہ حدیث خود مجھ ہی سے سُنی ہو، تاہم میں اس کو بڑی خاموشی سے سُنتا ہوں اور اُس پر یہ ظاہر کرتا ہوں کہ گویا

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۹۹ [3] ایضاً

میں نے وہ حدیث اُس سے قبل کسی سے سُنی ہی نہیں"۔ عمرو بن العاصم کہتے ہیں۔ میں نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مبارک رح سے بیان کی تو فرمایا "بخدا میں اپنا جوتہ نہیں اُتاروں گا جب تک کہ اس کو خود مہدی سے نہیں سن لوں گا"[۱]

فن حدیث میں اُن کا مرتبہ

امام نووی فرماتے ہیں " لوگ اُن کی توثیق، جلالت اور امامت پر متفق ہیں امام محمد الباقر فرماتے تھے " جہاں تک ہو سکے عطا کی حدیثیں لو"[۲]

حافظ ذہبی ان کو مفتی اہل مکۃ و محدثہم اور ابن سعد انہیں "کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔

فقہ

قرآن و حدیث کی مہارت نے اُن کو فقہ کا بھی امام بنا دیا تھا۔ ان کے عہد کے بڑے بڑے ائمۂ فقہ اُن کی فقاہت پر متفق ہیں۔ عمرو بن سعید کی والدۂ محترمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر مکہ میں تشریف لائے تو لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر متفرق مسائل دریافت کرتے تھے۔ آپ فرماتے "تم میرے لئے مسائل جمع کر رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس ابن ابی رباح موجود ہیں"[۳]۔ ربیعہ خود بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، مگر وہ بھی فرماتے تھے "عطاء فتویٰ میں تمام اہل مکہ سے سبقت لے گئے ہیں"[۴]۔ ابراہیم بن کیسان کا بیان ہے کہ خلفاء بنو اُمیہ قافلہ ہائے حج میں اعلان کرا دیتے تھے کہ عطا کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ نہ دے[۵]۔

حضرت ابن عمرؓ کی طرح حضرت ابن عباسؓ بھی فرمایا کرتے تھے۔

یا اھل مکۃ تجتمعون علیّ وعندکم عطاءؒ — اے اہل مکہ تم میرے پاس جمع ہو جاتے ہو، حالانکہ تمہارے پاس عطاء ہیں

امام ابو حنیفہ رحؒ کا ارشاد ہے "میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا"[۶]۔ محمد بن عبداللہ الدیباج کہتے تھے "میں نے عطاء سے بہتر کوئی مفتی نہیں دیکھا۔ ان کی مجلس ذکر الٰہی کی مجلس ہوتی تھی، ان سے جو بات پوچھی جاتی اُس کا جواب بہت عمدہ طریقہ پر دیتے تھے"[۸]

---

[۱] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [۲] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۴۴ [۳] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۴۴
[۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲ [۷] ایضاً [۸] ایضاً

اپنے عہد میں فتوے کے مرکز تھے۔ علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "کہ اہل مکہ کے مفتی صرف دو بزرگ تھے ایک مجاہد اور دوسرے عطا، مگر عطا مجاہد پر بھی سبقت لے گئے تھے[1]"

مناسک حج کا علم

یوں تو فقہ کی تمام جزئیات پر مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے۔ مگر خصوصیت سے مسائلِ حج کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلم المنقری کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ابوجعفر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگاہ عطاء ابن ابی رباح گذرتے ہوئے نظر آئے۔ اس پر ابوجعفر بولے "اب روئے زمین پر کوئی شخص عطاء سے زیادہ مناسکِ حج کا علم رکھنے والا نہیں ہے[2]"۔ قتادہ فرماتے تھے "عطاء ان بزرگوں میں سے ہیں جو مناسکِ حج کے بڑے عالم تھے[3]" خلفاء عہد مناسک حج کی تعلیم کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک خدمتِ اقدس میں خود حاضر ہوا، اور آپ نے اُس کو مناسک حج کی تعلیم دی[4]۔

حضرتِ عطاء کے فیضِ صحبت سے معمولی حیثیت کے انسان مسائلِ حج کے خاصے عالم ہو جاتے تھے اس سلسلہ میں ابن خلکان نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، وہ یہ ہے:-

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حج کے ارکان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سر کا حلق کرانا چاہا، ایک حجام مل گیا، میں نے پوچھا، کیا لو گے؟ بولا "عبادات میں شرط نہیں ہوتی، تم بیٹھ کر خط بنوالو" میں ذرا قبلہ سے مڑ کر بیٹھ گیا، حجام نے یہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ رو بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر میں نے چاہا کہ حجام سر کے بائیں جانب سے آغاز کرے تو اس پر اُس نے کہا "اپنی دائیں جانب ادھر کر دو" وہ برابر سر کا حلق کرتا رہا اور میں خاموش تھا۔ وہ بولا "تکبیر کہو" چنانچہ میں نے تکبیر کہی، حلقِ راس سے فراغت کے بعد میں نے چاہا کہ اپنے کجاوہ کی طرف چلا جاؤں، اُس نے پوچھا "کہاں جاتے ہو"؟

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴، [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [4] مختصر صفوة الصفوة ص ۱۹۵

میں نے کہا "جائے قیام پر" کہنے لگا "دو رکعتیں تو پڑھ لو پھر چلے جانا" امامِ اعظم فرماتے ہیں اس شخص کی یہ باتیں سن کر میں نے خیال کیا کہ یہ سب معلومات ضرور اس کو کسی سے حاصل ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اُس سے دریافت کیا تو اُس نے کہا "میں نے عطاء بن ابی رباح کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے"[1]

بیوع کا علم مناسکِ حج کے علاوہ کتاب البیوع کے بھی عالم متبحر تھے، خود ان کی صاحبزادے یعقوب ابن عطاء فرماتے ہیں "میرے باپ کو خرید و فروخت کے مسائل سب مسائل سے زیادہ محفوظ تھے"[2]

افتاء میں احتیاط مگر اس کمالِ تفقہ کے باوجود جو باتیں اُن کو معلوم نہیں ہوتی تھی اُس میں اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے۔ عبدالعزیز بن رفیع کا بیان ہے "ایک مرتبہ عطاء سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو اُنہوں نے فرمایا "میں نہیں جانتا" لوگوں نے کہا "تو پھر کیا آپ اپنی رائے نہیں بتائیں گے"۔ فرمایا مجھ کو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے کہ زمین میں میری رائے کی اطاعت کی جائے"[3] تاہم جب کبھی وہ رائے سے کام لیتے تھے، اُس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ ابن جریج کہتے ہیں "عطاء کوئی بات بیان کرتے تو میں پوچھتا "یہ علم ہے یا رائے ہے؟" اگر وہ کسی صحابی کا اثر ہوتا تو فرماتے "عِلْمٌ" ورنہ رائے ہوتی تو صاف کہہ دیتے "یہ رائے ہے"[4]

خلوص وللّٰہیت علم کے لئے وجاہت طلبی یا کسی اور دنیوی غرض سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہوتا۔ حضرت عطاء انتہا درجہ بے لوث تھے۔ سلمہ کہتے ہیں "میں نے صرف تین بزرگ دیکھے ہیں جنہوں نے علم خالصۃً لوجہ اللہ حاصل کیا ہے۔ طاؤس، مجاہد، اور عطاء"[5]

فراست ان میں فراست و ذکاوت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت حسن بصری

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۹ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۲ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [5] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱

نے اپنی مجلس میں فرمایا "منافق کی تین خاص علامتیں ہیں: کوئی بات کہے تو جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، اور وعدہ کرے تو اُس کو پورا نہ کرے" جنابِ عطاء نے یہ سُنا تو فرمایا "یہ تینوں عادتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں موجود تھیں۔ انہوں نے بات جھوٹ کہی، امانت میں خیانت کی، اور وعدہ کر کے اُس کی خلاف ورزی کی لیکن اس کے باوجود اللہ نے اُن کی نسل میں نبی پیدا کیا"۔ حسن نے یہ سُن کر فرمایا "وَفوقَ کُلِّ ذی علم علیم" ہر صاحب علم کے اوپر ایک علم والا ہے[1]۔

فصاحت و بلاغت اور پُرگوئی

حضرت عطاء زیادہ تر خاموش رہتے تھے، اور اگر بولتے بھی تھے تو ذکر اللہ کے سوا کوئی اور چیز مذکور نہیں ہوتی تھی، اور اس انداز میں اس کو بیان کرتے تھے کہ خدا کی طرف سے تائید معلوم ہوتی تھی۔ اسماعیل بن اُمیہ شہادت دیتے ہیں "کان عطاء یطیل الصمت فاذا تکلم یُخیّل الینا انہ یُؤیَّد"[2]۔ کوئی شخص کوئی سوال کرتا تو جواب بڑی پُرگوئی سے دیتے تھے[3]۔ حافظ ذہبی اُن کو "فصیحٌ کثیرُ العلم" لکھتے ہیں[4]۔

ہر دلعزیزی

ان اوصاف و کمالات نے اُن کو لوگوں میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز بنا دیا تھا، امام اوزاعی کا بیان ہے "جس دن عطاء کا انتقال ہوا وہ روئے زمین پر سب لوگوں سے زیادہ پسندیدہ تھے"[5]۔

سعید بن ابی عروبہ کہتے تھے "کسی مسئلہ پر اگر حسن، سعید بن المسیب، ابراہیم، اور عطاء جو الضار کے ائمہ ہیں جمع ہو جائیں تو پھر مجھ کو کسی مخالف کا ڈر نہیں ہے"[6]۔

زہد و ورع

علم و فضل کے بحرِ بے کراں ہونے کے ساتھ اُن میں زہد و ورع بھی اسی درجہ کا تھا۔ حافظ ذہبی کا ارشاد ہے "عطاء کے زہد، خدا پرستی اور علم کے مناقب بہت ہیں"[7]۔ حافظ ابنِ حجر کا مقولہ پہلے گذر چکا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: "عطاء علم اور ورع کے لحاظ

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۲ [4] ایضاً
[5] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱ [6] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۳ [7] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳

سے ساداتِ تابعین میں شمار کئے جاتے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد اپنی وفات تک برابر اُن کی طرف سے مساکین کو کھانا کھلاتے رہے۔ ابو نعیم کہتے ہیں یہ اُن کی طرف سے صدقۃ الفطر تھا[1]۔

قوتِ ایمانی | تمام نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کی اصل ایمان ہے، یہ اگر نہ ہو تو عند اللہ کسی عمل کا اعتبار نہیں۔ حضرت عطاء اس میں بھی نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ عبد الرحمٰن فرماتے ہیں "اللہ کی قسم میں تمام روئے زمین کے لوگوں کا ایمان حضرت ابوبکر کے ایمان کے اور تمام اہل مکہ کا ایمان حضرت عطاء کے ایمان کے برابر نہیں دیکھتا[2]"۔

عبادت | عبادت کا عالم یہ تھا کہ بیس برس تک مسجد کا فرش اُن کا بستر رہا[3]۔ تہجد میں روزانہ دو سو یا اس سے زائد آیات پڑھتے تھے۔ ابو معاویۃ المغربی کہتے تھے "میں نے سجدہ کے نشان حضرت عطاء کی دونوں آنکھوں کے درمیان دیکھے ہیں[4]۔ گویا وہ اس طرح اُن بزرگوں کی صف میں داخل تھے۔ جن کے متعلق قرآن مجید نے "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" کی شہادت دی ہے، اُن کا کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا محمد بن عبد اللہ الدیباج کا بیان ہے۔

انما کان مجلسہ ذکر اللہ لا یفتر[5]	ان کی مجلس اللہ کا ذکر ہوتا تھا جس میں وہ کبھی تساہل نہیں کرتے تھے۔

نماز نہایت خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے۔ وکان من احسن الناس صلوٰۃ[6]۔

حج | مستقل قیام گاہ مکہ معظمہ ہی تھا، تقریباً ہر سال حج کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں انہوں نے ستر حج کئے تھے[7]۔

اتباعِ حدیث | اتباع حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے، امام شافعی اُن کو اس طرح داد دیتے ہیں۔

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶ [2] ایضاً ص ۳۴۵ و ۳۴۶ [3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲ [6] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲ [7] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹۔

ولیس فی التابعین احدٌ اکثر اتباعاً للحدیث من عطاءٍ[1] — تابعین میں عطاء سے زیادہ کوئی اتباع حدیث کرنے والا نہیں تھا۔

خلوت گزینی تنہائی کو پسند کرتے تھے، بسا اوقات خاموش رہتے تھے۔ کوئی کچھ پوچھتا تو اس کو تشفی بخش جواب دیتے تھے۔

جلالت شان اُن کے علمی وقار کے سامنے بڑے بڑے لوگ سر تسلیم و اطاعت خم کرتے تھے اور خلفاءؒ کی مجلسوں میں اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا جاتا تھا۔ قتادہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھ سے سلیمان بن ہشام نے پوچھا "کیا اب مکہ میں کوئی بڑا فاضل ہے؟" میں نے جواب دیا" ہاں! بڑا فاضل کیا! تمام جزیرۃ العرب میں علم کے لحاظ سے کوئی اُس کے برابر نہیں ہے۔ اور وہ عطاء ابن ابی رباح ہیں[2]۔

منفردات جس بات کو حق سمجھتے تھے اُسے برملا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مسائل کی متعلق اُن کے غرائب مشہور ہیں، مثلاً وہ فرماتے تھے کہ کوئی شخص سفر کی نیت سے چلے تو اُس کے لئے شہر سے باہر نکلنے سے قبل ہی نماز کا قصر جائز ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ ابن منذر وغیرہ کی روایت کے مطابق اُن کی رائے تھی کہ اگر عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں واقع ہو جائیں تو صرف عید کی نماز پڑھی جائے، جمعہ یا ظہر کی نہیں[3]۔

حلیہ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو جس طرح معنوی و باطنی محاسن و فضائل سے نوازا تھا، صورت شکل کے اعتبار سے وہ ایسے نہیں تھے، رنگ کوے کی طرح سیاہ تھا ناک چپٹی تھی آنکھوں میں کانا پن تھا، جسم پر رعشہ کی کیفیت طاری رہتی تھی، پاؤں میں لنگ تھا، آخر میں نابینا بھی ہو گئے تھے، بال نہ بالکل گھونگریالے تھے اور نہ بالکل صاف سپاٹ بلکہ درمیانی درجہ کے[4]۔ سبحان اللہ! خاک کے پردہ میں ہیرے کی کنی ہوتی ہے۔

وفات مکہ معظمہ میں بعمر اٹھاسی برس ۱۱۵ھ میں وفات پائی۔ میمونؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا" افسوس! عطاء اپنے بعد کوئی اپنا مثل چھوڑ کر نہیں گئے[5]۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۱ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۴ [4] تہذیب التہذیب ج ۷،

طاؤس بن کیسانؒ

نام ونسب | طاؤس نام، ابو عبدالرحمن کنیت، بحیر بن ریسان حمیری کے غلام تھے۔ ان کے والد اہل فارس میں سے تھے، آل ہمدان سے موالات کرکے یمن کے مشہور مردم خیز شہر جند میں سکونت اختیار کرلی تھی[1]۔

علم وفضل | علم وفضل کے اعتبار سے طاؤس کبار تابعین میں سے تھے، علامہ نووی لکھتے ہیں

وھو من کبار التابعین والعلماء والفضلاءِ الصالحین[2] | وہ کبار تابعین علماء اور فضلاء صالحین میں سے تھے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں "اُن کی جلالت وفضیلت، اور وفورِ علم پر سب کا اتفاق ہے[3]۔ عمرو بن دینار فرماتے تھے "میں نے طاؤس جیسا کوئی نہیں دیکھا"۔ ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں "وہ امام اور تابعین میں سب سے زیادہ حلال وحرام کو جاننے والے تھے[4]"۔

حدیث | حدیث کے جلیل القدر حافظ تھے عبدالملک بن میسرہ نے خود اُن سے نقل کیا ہے کہ میں نے پچاس صحابہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ جن صحابہ کے سرچشمۂ فیض وکرم سے سیراب ہوئے اُن کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:۔

حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، ام المومنین حضرت عائشہ، سراقہ ابن مالک، صفوان بن اُمیہ، جابر رضی اللہ عنہم[5]۔

حبر اُمت حضرت عبداللہ بن عباس کے تلمیذ خاص تھے۔ ابن عیینہ فرماتی

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۵۱ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۳

[5] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹

ہیں۔ میں نے عبداللہ بن یزید سے پوچھا "تم کس کے ساتھ ابن عباس کے پاس جاتے تھے؟" فرمایا "عطاء اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ"، میں نے کہا "اور طاؤس؟" بولے "وہ! طاؤس تو اُن کے پاس خواص کے ساتھ جاتے تھے"۔[1]

تلامذہ تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، اُن میں جو زیادہ مشہور ہیں وہ یہ ہیں:-

خود اُن کے صاحبزادہ عبداللہ، وہب بن منبہ، سلیمان التیمی، سلیمان الاحول ابوالزبیر، امام زہری، ابراہیم بن میسرہ، حبیب بن ابی ثابت، حکم بن عتیبہ، حسن بن مسلم سلیمان بن موسی الدمشقی، عبدالملک بن میسرہ، عمرو بن شعیب، عمرو بن دینار، مجاہد بن جبیر، لیث بن ابی سلیم، عمرو بن مسلم الجندی، قیس بن سعد المکی۔[2]

حدیث میں احتیاط حدیث روایت کرتے تھے تو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک حرف کو صاف طریقہ سے ادا کرتے تھے۔ لیث بن ابی سلیم کہتے ہیں:-

کان طاؤسٌ یَعُدُّ الحدیثَ حرفاً حرفاً — طاؤس حدیث کا ایک ایک حرف شمار کرتے تھے۔

یحییٰ بن معین اور ابوزرعہ دونوں ان کو "ثقہ" قرار دیتے ہیں۔[3]

فقہ حدیث کی طرح فقہ میں بھی بڑا پایہ رکھتے تھے۔ ابن خلکان ان کو "فقیہ، جلیل القدر و نبیہ الذکر" بتاتے ہیں۔[4] حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

کان طاؤسٌ شیخ اھل الیمن وبرکتھم ومفتیھم لہ جلالۃٌ عظیمۃٌ۔[5] — طاؤس اہل یمن کے شیخ، اُن کے لئے برکت اور اُن کے مفتی تھے، اُن کی جلالت شان بہت بڑی ہے۔

قیس بن سعد کہتے تھے "طاؤس کی وقعت ہمارے ہاں وہی ہے جو ابن سیرینؒ کی اہل بصرہ میں ہے"۔[6] ابن عماد الحنبلی کا قول اوپر گذر چکا ہے کہ طاؤس حلال و حرام کے

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹
[4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۲ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [6] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹

مسائل تابعین میں سب سے زیادہ جانتے تھے۔

ابن معین سے کسی نے پوچھا "آپ کو طاؤس زیادہ پسند ہیں یا سعید بن جبیر فرمایا: "میں ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا"

فتویٰ میں احتیاط باایںہمہ علم وفضل فتویٰ دینے میں بہت محتاط تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا فرمایا "اگر میں کہوں تو ڈرتا ہوں، اور خاموش رہوں تو اُس سے بھی خوف کرتا ہوں، اور کلام وسکوت کی درمیانی راہ اختیار کروں تو اس سے بھی ڈرتا ہوں"

جلالت شان بجید عابد وزاہد تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں "وہ یمن کے عبادت گذار لوگوں میں شمار ہوتے تھے[1]" سجدہ کا نشان اُن کی دونوں آنکھوں کے درمیان صاف نظر آتا تھا۔[2] بستر مرگ پر بھی کھڑے ہوکر نماز ادا کرتے تھے[3]۔ چالیس حج کئے تھے[4]۔ طواف میں کلام نہ کرتے تھے، فرماتے تھے فانما الطواف صلوٰۃ (طواف نماز ہے)[5] ان اعمالِ صالحہ کا ہی طفیل تھا کہ مستجاب الدعوات تھے حضرت ابن عباس نے فرمایا "میں گمان کرتا ہوں کہ طاؤس جنتی آدمی ہیں[6]"

شوق ثواب ہر کام میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اُن کے صاحبزادہ عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے والد طاؤس کے ہمراہ حج کرنے آتے تھے یمن سے مکہ تک کا راستہ ایک ماہ میں طے ہوتا تھا۔ مگر میرے والد واپسی میں قصداً دور دراز کے راستوں سے گذرتے تھے اور گھر دو ماہ میں پہنچتے تھے، ہم اُن سے اس کی وجہ دریافت کرتے تو فرماتے "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آدمی جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا وہ سفر میں ہی رہتا ہے[7]"

دنیا سے استغنا حضرت عطاء کے احوال میں سلمہ بن کہیل کا مقولہ گذر چکا ہے کہ "میں صرف

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴

[5] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵

تین بزرگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے علم خالصۃً لوجہ اللہ حاصل کیا تھا اِن تین میں ایک حضرت طاؤس بھی ہیں"۔ چنانچہ آپ دنیا اور اہل دنیا سے مکمل استغناء رکھتے تھے اور ہمیشہ ایمان و اعمال صالحہ کی دعاء کرتے رہتے تھے۔ محمد بن سعید کا بیان[1] ہے "طاؤس کی عام دعاء تھی "اے اللہ تو مجھ کو مال اور اولاد سے محروم کر دے اور ایمان و عمل سے بہرہ اندوز فرما"[2]۔

ارباب ثروت و حکومت سے بے نیازی

جس کی آنکھوں میں کوکبۂ جلالِ خداوندی سمایا ہوا ہو اور جو خود اقلیم علم و عمل کا تاجدار ہو وہ کسی بادشاہ یا حاکم کو کب نظر میں لا سکتا ہے۔ حضرت طاؤس کا بھی یہی حال تھا ابن عیینہ کا بیان ہے "حکومت سے بچنے والے صرف تین[3] بزرگ تھے۔ ابوذر غفاری رضؓ اپنے عہد میں، طاؤس اپنے عہد میں، اور ثوری اپنے زمانہ میں[4]"۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں "لوگوں کے قبضہ میں جو کچھ ہوتا ہے، میں نے حضرت طاؤس سے زیادہ اُس سے بچنے والا اور پاکدامن کوئی نہیں دیکھا"[5]۔ خود اُن کا مقولہ تھا "میں نے ارباب ثروت و دول سے زیادہ کسی کو شر انگیز نہیں دیکھا"[6]۔

ایک مرتبہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے پاس گئے جو اُس وقت گورنر تھا، وقت صبح کا تھا اور ٹھنڈا، طاؤس جا کر کرسی پر بیٹھ گئے محمد بن یوسف نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک طیلسان لا کر طاؤس کو اُڑھا دو، اُس نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔ حضرت طاؤس برابر اپنے کاندھوں کو حرکت دیتے رہے، یہاں تک کہ وہ طیلسان گر پڑا۔ محمد بن یوسف یہ دیکھ کر غضبناک ہو گیا۔ وہب بن منبہ نے طاؤس پر اظہار ناراضگی کیا اور فرمایا "اگر اس طیلسان سے آپ کو ایسا ہی استغناء تھا تو محمد بن یوسف کو ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ اُسے لے لیتے اور پھر اس کو فروخت کر کے قیمت مساکین کو دیدیتے"، طاؤس بولے "اگر مجھ کو اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرے بعد یہ کہتے کہ طاؤس نے طیلسان قبول کر لیا، تو میں قبول کر لیتا۔[7]"

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۰ [3] ایضاً [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [5] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴

ارباب دولت و ثروت کے ادنیٰ سے ادنیٰ احسان کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ نعمان بن زبیر الصنعانی فرماتے ہیں "ایک مرتبہ یمن کے حاکم نے طاؤس کے پاس پانسو دینار بہ طور ہدیہ بھیجے، مگر انہوں نے ان کو قبول نہیں کیا اور وہ واپس کر دیے گئے"[۱]

اس حد درجہ استغناء کی وجہ سے اُن کی نگاہ میں امیر و غریب سب یکساں تھے ابراہیم بن میسرہ کا بیان ہے "میں نے طاؤس کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں شریف و غیر شریف دونوں برابر ہوں"[۲]

تحصیلداری کا عہدہ

محمد بن یوسف نے کچھ دنوں کے لئے انہیں تحصیلدار بھی بنا دیا تھا، مگر انہوں نے کس شان سے تحصیلداری کی اس کی روئداد سُنئے۔ ابراہیم فرماتے ہیں۔ میں نے طاؤس سے دریافت کیا "آپ کس طرح تحصیلداری کرتے تھے؟ فرمایا "میں مالدار کے پاس جا کر کہتا تھا" خدا تم پر رحم کرے، اُس نے تم کو جو عطا کیا ہے اُس کی زکوٰۃ ادا کرو" اس کہنے پر اگر وہ زکوٰۃ دے دیتا تو ہم لے لیتے، ورنہ ہم اُس سے کچھ نہ کہتے تھے"[۳]

خلفاء کو نصیحت

بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے خلفاء کو برملا نصیحت کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھ کر بھیجا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے سب کام اچھے ہوں تو اچھے لوگوں کو عہدہ دار بنائیے" آپ نے یہ سُن کر فرمایا "میری بھلائی کے لئے یہ نصیحت بہت کافی ہے"[۴]

انہی کی فیض صحبت و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو جرأت حق گوئی پائی جاتی تھی اُس کا اثر اولاد میں بھی موجود تھا۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "ایک مرتبہ خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور نے حضرت طاؤس کے صاحبزادہ عبداللہ اور امام مالک بن انس دونوں کو بلایا۔ یہ تشریف لے گئے تو تھوڑی دیر تک ابو جعفر منصور سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اُٹھا کر اُس نے ابن طاؤس سے کہا "آپ اپنے والد ماجد کی کوئی روایت سُنائیے" بولے "مجھ

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [۲] ایضاً [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۹۴ [۴] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۳

سے میرے باپ نے حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اُس شخص کو ہوگا جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنی سلطنت میں شریک کیا (بادشاہ بنایا) اور اس کے باوجود اُس نے ظلم کو اپنے حکم میں جائز رکھا۔" منصور یہ سُن کر منقبض ہوگیا۔ مالک بن انس کو اندیشہ ہوا کہ عبداللہ بن طاؤس قتل کردیے جائینگے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد منصور نے ابن طاؤس سے کہا کہ ذرا یہ دوات مجھ کو دینا۔ منصور نے تین مرتبہ دوات مانگی، مگر ابن طاؤس نے نہیں دی۔ منصور نے دوات نہ دینے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا "مجھ کو ڈر ہے کہ تم اُس سے کوئی معصیت کی بات نہ لکھ دو کہ اس کی پاداش میں اعانت علی الاثم کا مرتکب ہو کر میں بھی پکڑا جاؤں۔" منصور یہ سُن کر برہم ہوگیا اور دونوں کو چلے جانے کا حکم دیا، ابن طاؤس بولے "ہم یہی تو چاہتے تھے"، امام مالک بن انس فرماتے ہیں "میں نے دراصل طاؤس کے صاحبزادہ کا فضل اُسی دن سے جانا ہے"۔[۱]

ورع واتقاء | مباح چیزیں جن میں کسی درجہ کا کوئی شائبہ قباحت ہو، اُن سے احتراز کرنا عین تقویٰ ہے۔ حضرت طاؤس اس کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے "ایک مرتبہ اُنہوں نے ایک جماعت کو دیکھا کہ قرآن مجید کی تجارت کر رہی ہے، تو فوراً الم سے اِنّا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا"[۲] لیث بیان کرتے ہیں کہ طاؤس سابوری غلام اور اون کی تجارت کو مکروہ سمجھتے تھے[۳]۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے قریش کے چند لوگوں کو دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور اُن کی وضع اسلاف کی وضع سے بدلی ہوئی ہے۔ فرمایا "لوگو! تم کو کیا ہوگیا۔ کہ ایسے لباس پہنتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے نہیں پہنے۔ اور ایسی رفتار سے چلتے ہو کہ ناچنے والے بھی اس طرح نہیں چلتے"۔[۴] جو خطوط اُن کے پاس آتے تھے وہ اکٹھے ہو جاتے تو غالباً از راہِ احتیاط اُن کو جلا ڈالتے تھے[۵]۔ ابن طاؤس فرماتے ہیں "میرے باپ اس کو بہت بُرا جانتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کا واسطہ

---

[۱] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۳ [۲] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳ [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [۴] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵

[۵] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳

دے کر کسی چیز کا سوال کرے[1]۔ فرماتے تھے "اگر کوئی نصرانی یا یہودی تم کو سلام کرے تو اس کے جواب میں "علاک السلام" کہو[2]"

رحمدلی | رحمدلی بھی بدرجہ غایت تھی، ایک مرتبہ ایک چور کو دیکھا کہ لوگ اُس کو پکڑ کر لیجا رہے ہیں۔ آپ نے ایک دینار اُس کا فدیہ دیا اور رہا کرا لیا[3]۔

خود اعتمادی | اُن کو اپنے علم پر پورا بھروسہ بھی تھا، حبیب بن ابی ثابت کہتے ہیں "مجھے ایک مرتبہ حضرت طاؤس نے فرمایا "میں جب تمہارے سامنے کوئی حدیث بیان کروں اور اس کی توثیق بھی کر دوں، پھر تم اُس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو[4]"

لباس | بالطبع فقر پسند تھے، لباس میں عموماً سادگی پسند کرتے تھے"۔ اُن کے صاحبزادہ سے کسی نے پوچھا "آپ کے والد سفر میں کیا پہنتے تھے"؟ بولے "وہ صرف دو قمیصوں پر کفایت کرتے تھے۔ اُن کے نیچے پاجامہ نہیں پہنتے تھے"۔ ابن زاذان کا بیان ہے "میں نے طاؤس رح کو دیکھا کہ دو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی حنا کا خضاب بھی استعمال کرتے تھے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وہ چہرہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے، صرف رات کو اُسے اُٹھاتے تھے، عمامہ باندھتے تھے اور اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ اُس کے ایک حصہ کو ٹھوڑی کے نیچے لیجا کر بہ طور ڈھاٹے کے باندھا جائے[5]۔

زندہ دلی | مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل زاہدِ خشک تھے، بلکہ اسلامی تہواروں میں بڑی خوشی سے شریک ہوتے تھے۔ اور خوشیاں مناتے تھے۔ عید کے موقع پر اپنی تمام جواری کو خواہ سیاہ فام ہوں یا غیر سیاہ فام، حکم کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائیں[6]۔

وفات | پہلے گذر چکا ہے، حج چالیس کئے تھے چنانچہ وفات بھی بسلسلۂ حج ہی ہوئی۔ ذی الحجہ سنہ ۱۰۶ھ کی ساتویں تاریخ تھی، ابھی مکہ مکرمہ میں ہی مقیم تھے کہ روح قفس عنصری سے ملاءِ اعلیٰ

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۲۹۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ابن سعد، ج ۵ ص ۳۹۲ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۲۹۳

کی طرف پرواز کر گئی[1]۔ اس وقت آپ کی عمر کچھ اوپر نوّے سال کی تھی[2]۔ جنازہ میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ کا چلنا دشوار تھا، ابراہیم بن ہشام امیر مکہ نے پولیس کا انتظام کرایا۔ عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب بھی شریکِ جنازہ تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ حضرت طاؤس کے جنازہ کو کاندھا دے رہے ہیں، اور ہجوم کی وجہ سے آپ کی ٹوپی گر گئی ہے، اور چادر پیچھے سے پھٹ گئی ہے۔ خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک نے نماز پڑھائی، اور پھر اُن کے جسم کی امانت مکہ کی خاکِ پاک کے سپرد کردی گئی[3]۔ لوگوں نے دعا کی "اللہ تعالیٰ طاؤس پر رحم کرے، اُنہوں نے چالیس حج کئے تھے[4]"

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [2] ابن سعد، ج ۵ ص ۳۹۵ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۳ [4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹

سلیمان بن مہران (اعمش)

نام و نسب سلیمان نام، ابو محمد کنیت، اُن کے والد کا نام مہران تھا، مہران نسلاً عجمی تھے آبائی وطن طبرستان تھا۔ پھر کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، بنو کاہل کے غلام تھے، اور اسی نسبت سے کاہلی کہلاتے تھے[۱]

پیدائش حضرت امام حسین کی شہادت کے دن یعنی عاشوراء محرم ۶۱ھ کو دنباوند میں پیدا ہوئے جو رے الجبال کا ایک علاقہ ہے[۲]

فضل و کمال اعمش کے والد کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے جو اُس زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اعمش کی نشو و نما یہیں ہوئی۔ ابتداءً اگرچہ غلام تھے، مگر فطری استعداد و صلاحیت اور طبعی شوقِ علم کے لئے غلامی مانع نہ ہو سکی، انہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ وہ علماء کوفہ کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ حافظ ذہبی ایسا نقاد انہیں "شیخ الاسلام" اور "الحافظ الثقہ" کہتا ہے۔ عیسیٰ ابن یونس کہتے تھے "ہم نے اور ہمارے پیشرو لوگوں نے اعمش کا مثل نہیں دیکھا"۔ حافظ ابن حجر بھی انہیں "علامۃ الاسلام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ تمام مذہبی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں "اعمش کتاب اللہ کے بڑے قاری احادیث کے بڑے حافظ، اور علم فرائض کے ماہر تھے"[۳] ابن مدینی کا بیان ہے۔ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں علم چھ بزرگوں نے محفوظ رکھا ہے" مکہ میں عمرو بن دینار نے۔ مدینہ میں زہری نے، ابو اسحٰق السبیعی اور اعمش نے کوفہ میں اور قتادہ اور یحییٰ بن ابی کثیر نے بصرہ میں[۴]

---

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۴ [۲] ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹ و تاریخ خطیب [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵ [۴] تہذیب

قرآن مجید کا علم

یوں تو حضرت اعمش تمام اسلامی علوم میں ہی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے مگر قرآن مجید کے ساتھ انہیں خاص شغف تھا۔ حضرت شعبہ اُن کا ذکر کرتے تھے تو فرماتے تھے: "قرآن، قرآن"۔ عمرو بن علی کہتے ہیں "صدقِ مقال کی وجہ سے لوگ حضرت اعمش کو "قرآن" ہی کہنے لگے تھے" حافظ ابن حجر انہیں "علوم قرآنیہ کا سردار" لکھتے ہیں[۱]۔ ہشیم فرماتے ہیں۔

مارایت بالکوفۃ احدًا اقرأ لکتاب اللہ منہ[۲]

میں نے کوفہ میں اُن سے زیادہ قرآن کا بہتر قاری نہیں دیکھا

قرآنِ مجید کا درس دیتے تھے طلحہ بن مصرف نے انہی کے پاس قرآن پڑھا تھا۔ مگر آخر عمر میں کبرسن اور ضعف کے باعث درس ترک کر دیا تھا، پھر بھی ماہ شعبان میں تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھاتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے قرآن لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اعمش کی قرأت کے مطابق اصلاح کرتے جاتے تھے۔ آپ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے[۳]

حدیث

حدیث میں اُن کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ابن عمار فرماتے ہیں "محدثین میں اعمش سے زیادہ کوئی ثقہ نہیں ہے" عجلی کہتے ہیں "اعمش ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بڑے محدثِ اہل کوفہ تھے[۴]۔" علامہ حافظ ذہبی انہیں "الحافظ الثقہ" لکھتے ہیں، ابن عیینہ انہیں احفظھم للحدیث بتاتے ہیں[۵]۔ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ جریر اعمش سے کوئی روایت کرتے تھے تو اُس کے بعد فرمایا کرتے تھے "یہ شاہی خلعت ہے"۔

امام زہری اہل عراق کے علم کے قائل نہیں تھے۔ اسحٰق بن رشد نے ایک مرتبہ اُن سے کہا کہ کوفہ میں بنو اسد کا ایک غلام ہے جو چار ہزار حدیثیں بیان کرتا ہے۔ امام زہری نے کہا "چار ہزار!" اسحٰق بولے "ہاں چار ہزار" اگر آپ کہیں تو میں اُس کا کچھ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ [۲] ایضاً [۳] ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹ [۴] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳

[۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵

حصہ آپ کے سامنے پیش کروں؟ فرمایا "ہاں لاؤ" چنانچہ انہوں نے بعض روایتیں سنائیں۔ اسحق کہتے ہیں زہری روایات پڑھتے جاتے تھے اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ پھر فرمایا "خدا کی قسم! یہ وہ علم ہے جس کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا"[۱] شعبہ فرماتے ہیں:-

ماشفانی احدٌ فی الحدیث ماشفانی الاعمش[۲] — مجھ کو حدیث میں کسی نے اتنی شفا نہیں دی جس قدر کہ اعمش نے شفا دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات انہیں خصوصیت کے ساتھ زیادہ یاد تھیں قاسم بن عبدالرحمن کے پاس سے ایک مرتبہ حضرت اعمش گذرے تو انہوں نے فرمایا "یہ عبداللہ بن مسعود کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں"[۳]

ابن معین اعمش عن ابراھیم عن علقمہ عن عبداللہ کو اجود الاسانید کہتے تھے[۴]

ابوبکر بن عیاش فرماتے ہیں کہ ہم حضرت اعمش کو "سید المحدثین" کہتے تھے[۵]

جیساکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ مرویات اعمش کی تعداد چار ہزار تھی۔ مگر ابن مدائنی کل تیرہ سو بتاتے ہیں[۶] ان کی روایات کے معتبر ہونے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ لوگ صداقت کی وجہ سے انہیں "قرآن" کہتے تھے۔

احادیث کی کثرت روایت کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا "تم لوگ جب حدیث سننے کے لئے کسی کے پاس جاتے ہو تو اُسے جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہو۔ خدا کی قسم یہ لوگ شرّ الناس ہیں"[۷]

اساتذہ | حضرت اعمش نے جن بزرگوں سے سماع حدیث کیا تھا ان کے اسماء حسب ذیل ہیں عبداللہ بن ابی اوفیٰ، زید بن وہب، ابو وائل، ابو عمرو الشیبانی، قیس بن ابی حازم

---

[۱] ابن سعد ج ۲ ص ۲۳۹ [۲] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ [۳] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۴

[۴] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۵ [۵] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۱ [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵

[۷] ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹

عکرمہ، معرور بن سوید - ابراہیم النخعی -

حضرت انس بن مالک سے ملاقات ثابت ہے، روایت ثابت نہیں ہے، اسی بناپر حضرت اعمش کی جو روایتیں حضرت انس سے مروی ہیں اُن کو مرسل قرار دیا گیا ہے - ابن المنادی کی ایک روایت ہے کہ اعمش نے ایک مرتبہ ابوبکرۃ الثقفی کو دیکھا تو حدیث سُننے کے اشتیاق میں جاکر اُن کی رکاب پکڑلی، ابوبکرہ بولے "بٹیا اس فعل سے تم نے اپنے رب کا اکرام کیا ہے" لیکن حافظ ابن حجر اس روایت کو غلط فاحش قرار دیتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ اعمش ۵۹ھ یا ۶۱ھ میں تولد ہوئے تھے اور ابوبکرہ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں انتقال کرچکے تھے، اس بناپر دونوں میں کس طرح ملاقات ہوسکتی ہے۔[1]

تلامذہ — تلامذہ میں جو زیادہ مشہور اور نامور ہوئے اُن کے نام یہ ہیں - شعبہ - سفیان ثوری سفیان بن عیینہ، زائدہ، وکیع، عبیداللہ بن موسیٰ، ابراہیم بن طہمان، جریر بن حازم وغیرہم

فقہ و فرائض — قرآن و حدیث کی طرح فقہ میں عموماً اور فرائض میں خصوصاً بڑا کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہ اُن کو "اعلمھم بالفرائض" فرائض کے سب سے بڑے عالم بناتے ہیں۔

مغیرہ کا بیان ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد فرائض میں ہم نے اعمش کی طرف رجوع کرلیا تھا - ابن عیینہ ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں کہ اعمش اپنے ساتھیوں سے چار چیزوں میں بڑھ گئے - اُن میں وہ فرائض کا بھی شمار کرتے ہیں۔[2]

استغناء و خودداری — ان علمی کمالات کے ساتھ خدا نے ان کو حد درجہ مستغنی اور فقر منش بنایا تھا امیروں اور شاہوں کا جاہ و حشم اُن کی چشم قناعت کو خیرہ نہیں کرسکتا تھا - امام شعرانی لکھتے ہیں "اعمش کو روٹی تک میسر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی مجلس میں اغنیاء و سلاطین سب سے زیادہ فقیر معلوم ہوتے تھے"[3]

عیسیٰ بن یونس کا بیان ہے "فقر و حاجت کے باوجود اغنیاء و سلاطین حضرت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ [3] طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۳۸

اعمش کی نگاہ میں سب سے زیادہ حقیر تھے۔[1]

ایک دفعہ خلیفہ ہشام نے اُن کو لکھا کہ میرے پاس حضرت عثمانؓ کے فضائل اور حضرت علیؓ کے معائب لکھ کر بھیجدو۔" انہوں نے قاصد کے سامنے ہی وہ خط ایک بکری کے منہ میں رکھ دیا اور اس نے چبا کر اُس کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر قاصد سے فرمایا "جاؤ یہ تمہاری تحریر کا جواب ہے۔" قاصد بولا اگر میں یوں ہی واپس چلا گیا تو قتل کر دیا جاؤں گا۔" لوگوں نے یہ سُن کر حضرت اعمش سے درخواست کی کہ جواب ضرور لکھ دیجئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر جواب لکھا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اما بعد اگر حضرت عثمانؓ کی ذات میں تمام دنیا کی خوبیاں جمع ہوں تب بھی اُن سے تمہاری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اگر حضرت علیؓ کی ذات میں تمام دنیا کی بُرائیاں جمع ہو جائیں تو اُن سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تم کو چاہیے کہ اپنے نفس کی خبر لو۔"[2]

بے لاگ تنقید | وہ چونکہ کسی سے کوئی غرض اور طمع نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اپنی رائے کے اظہار میں بھی بڑے بے باک تھے۔ کسی کی خفگی اور خوشنودی کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر بن عیاش کہتے ہیں "ایک مرتبہ ہم چند محدثین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے آخر میں اعمش کی خدمت میں حاضر ہوئے اُنہوں نے پوچھا۔ کس کس کے پاس میں ہو کر آئے ہو؟" ہم نے ایک ایک کا نام لیا اور وہ ہر ایک کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے رہے۔ کسی کو کہا، "وہ تو ایک پھٹا ہوا طبل ہے۔" کسی کے متعلق فرمایا "وہ اُڑنے والا پرندہ ہے" اور کسی کے بارہ میں بولے "وہ دف ہیں۔"[3] غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض اُنہیں تند مزاج کہتے تھے۔

لباس میں سادگی | کمالِ استغناء کی وجہ سے لباس کا بھی کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ ابن عیینہ

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۸ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ [3] تاریخ خطیب ج ۹ ص ۱۱

فرماتے ہیں "ایک مرتبہ ہم نے اعمش کو دیکھا کہ پوستین اُلٹی پہن رکھی تھی اور جو قبا زیب تن تھی بوسیدگی کی وجہ سے اُس کے تاگے اُن کے پیروں پر لٹک رہے تھے۔ پھر خود ہی فرمایا "کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا تو پھر بھی میرے پاس کوئی آتا۔ اگر میں بقال ہوتا تو لوگ مجھ سے سودا خریدتے ہوئے استکراہ کرتے۔

ایک مرتبہ عیسیٰ بن موسیٰ (جو اُس زمانہ میں حاکم تھا) نے قراء کو عطیہ دینے کا حکم دیا، چنانچہ یہ حضرات اپنے اپنے ملبوسات کے ساتھ تشریف لائے۔ اعمش بھی آئے تو اس شان سے کہ چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو اُن کی نصف پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر فرمایا "یہاں ابن ابی لیلیٰ ہیں اور یہاں ابن شبرمہ۔ تم ہم کو ان لمبی لمبی دیواروں سے نجات دو"۔ عیسیٰ یہ سُن کر بولا "آج ہمارے پاس اعمش کے سوا کوئی قاری (یعنی واقعی قاری) آیا ہی نہیں، تم جلدی جلدی ان کے صلہ کا بندوبست کر دو"[۱]۔

زہد و عبادت | علمی واخلاقی کمالات کے ساتھ اپنے وقت کے سب سے بڑے عابد و زاہد بھی تھے خریبی کا قول ہے "اعمش کا جس دن انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو اُن سے زیادہ عبادت گذار ہو۔ وہ صاحبِ سُنت تھے"[۲]۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وہ علمِ نافع اور عملِ صالح دونوں میں سردار تھے"[۳]۔

یحییٰ قطان کے سامنے کسی نے اعمش کا ذکر کیا تو فرمانے لگے "وہ بڑے عابد و زاہد تھے، نماز باجماعت کے پابند تھے، اور ہمیشہ صفِ اوّل میں رہتے تھے۔ وکیع کا بیان ہے "اعمش نے تقریباً ستر سال تک تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہونے دی"[۴]۔

جامعیت | ان سب علمی وعملی فضائل نے اُن کو مجموعۂ کمالات بنا دیا تھا، چنانچہ عیسیٰ بن یونس نے فرمایا "ہم نے اور ہم سے پہلے کسی قرن نے اعمش ایسا بزرگ نہیں دیکھا"۔ یحییٰ فرماتے ہیں، اعمش صاحبِ فضل وقرآن تھے، اور وہ بہت بلند مرتبہ انسان تھے۔

---

۱ تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۶ ۲ ایضاً ص ۵-۶ ۳ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۴ ۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶ ۵ تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۰

ظرافت | مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ وہ بالکل زاہد خشک مزاج تھے، بلکہ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

وکان لطیف الخلق مزاحاً | وہ بڑے خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔

ایک مرتبہ چند لوگ اُن کے پاس سماع حدیث کے لئے آئے۔ اعمش باہر نکلے تو فرمایا۔ "اگر میرے گھر میں وہ نہ ہوتا جو مجھ کو تم سے زیادہ مبغوض ہے (یعنی بیوی) تو میں گھر سے نکلتا"۔ ایک دفعہ اُن میں اور بیوی میں کچھ ناچاقی ہو گئی۔ حضرت اعمش نے ثالثی کے لئے کسی شخص کو بلایا۔ اُس شخص نے آکر حضرت اعمش کی بیوی سے کہا "تم اپنے شوہر کی آنکھوں کے چندھے پن اور اُن کی پنڈلیوں کے بدنما ہونے کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کتنے بڑے امام ہیں اور اُن کی کیا شان ہے" اعمش بولے "خدا تم کو رسوا کرے، تم نے تو اور میری بیوی کو میرے عیوب بتا دیے"۔

ایک دفعہ داؤد بن عمر نے جو خود جولاہا تھا پوچھا "جولاہے کی امامت کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟" فرمایا "اُس کے پیچھے اگر نماز بے وضو پڑھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔ ایک مرتبہ اعمش بیمار تھے۔ امام ابو حنیفہ اُن کی عیادت کو تشریف لائے، دیر تک بیٹھے رہے، چلنے لگے تو فرمایا "میں اتنی دیر تک آپ کے پاس بیٹھا، اس سے تو آپ پر بڑا بار ہوا ہوگا" اعمش بولے "آپ اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو بھی میرے لئے بھاری ہی ہوتے ہیں"[1] (اس میں امام اعظم کی جلالتِ علم کی طرف تلمیح ہے)

فصاحت | گفتگو بڑی فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وکان فصیحاً"[2]

تحقیرِ نفس | اس پایہ کے مجموعۂ کمالات ہونے کے باوجود اپنی ذات کو بالکل حقیر و ہیچ سمجھتے تھے اُنھوں نے وصیت کی تھی "میں مرجاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ کرنا اور مجھ کو میرے رب کے پاس لیجاکر دفن کر دینا۔ میں اس سے فروتر ہوں کہ لوگ

[1] یہ واقعات ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ سے ماخوذ ہیں [2] تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۵

میرے جنازہ میں شریک ہوں [1]

وفات باختلاف روایت ۱۴۷ھ یا ۱۴۸ھ میں وفات پائی [2]۔ انتقال کے بعد جریر نے خواب دیکھا۔ پوچھا "اے ابو محمد! کیا حال ہے؟" فرمایا "ہم نے مغفرت کی وجہ سے نجات پائی۔ الحمد للہ رب العالمین [3]"

---

[1] طبقات کبریٰ امام شعرانی ج ۱ ص ۳۸ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۲۴۰ [3] خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۳

ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی

نام ونسب ایوب نام، ابوبکر کنیت۔ والد کا نام کیسان تھا اور کنیت ابو تمیمہ نسلاً کوئی ان کو عنبری کہتا ہے اور کوئی جہنی۔ سختیانی کے لقب سے علامہ ابن عبد البر کے قول کے مطابق اسی لئے مشہور تھے کہ بصرہ میں بکرے کی دباغت دی ہوئی کھالیں فروخت کرتے تھے[1]۔ حضرت ایوب قبیلۂ عنزہ یا جہینہ کی غلامی میں تھے[2]۔

فضل وکمال ایوب غلام تھے، لیکن کشورِ علم وعمل کے تاجدار تھے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں "سب ان کی جلالت وامامت، حفظ اور ثقاہت، وفورِ علم، فہم اور سیادت پر متفق ہیں[3]"۔ علامہ ابن سعد تحریر فرماتے ہیں "ایوب ثقہ اور حدیث میں ثبت تھے جامع اور عدل تھے، متقی، کثیر العلم اور حجہ تھے[4]"۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں۔ لم الق مثلہٗ (میں ان کے مثل سے نہیں ملا) ابن عماد الحنبلی ان کو احد الاعلام لکھتے ہیں۔ حماد بن زید فرماتے ہیں جن لوگوں سے میں نے مجالست کی ہے، ایوب ان سب میں افضل تھے اور اتباعِ سنت میں سب سے زیادہ شدید تھے۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں "ایوب علماء کے سردار، حفاظِ حدیث کے امام، ثقہ اور بیدار مغز بزرگوں میں سے تھے[5]۔ لوگ انہیں "جہبذ العلماء" کہتے تھے۔ ہشام بن عروہ کہتے تھے "میں نے بصرہ میں ایوب کا مثل نہیں دیکھا"۔ ابو عثمان نے حضرت حسن بصری سے سنا کہ وہ ایوب کو بصرہ کے نوجوانوں کا سردار کہتے تھے۔ ابن عون فرماتے ہیں "محمد بن سیرینؒ کی وفات ہوگئی تو ہم نے اپنا مرجع ایوب کو بنالیا۔ ابو حاتم کہتے ہیں: ثقۃٌ لا یسأل عن مثلہ (وہ ایسے ثقہ ہیں کہ ان

---

[1] تہذیب الاسماء قسم اول ج ۱ ص ۱۳۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۹۷ [4] ابن سعد ج ۷، قسم دوم ص ۱۴

[3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۱ [5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۱

کے مثل کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ محمد بن سیرینؒ نے کوئی حدیث بیان کی۔ مسلم بن کیسان نے اُن سے پوچھا "آپ سے یہ روایت کس نے نقل کی ہے؟ فرمایا "الثبت الثبت ایوب نے"[1]

حدیث | حضرت ایوب کا خاص فن حدیث تھا، حافظ ذہبی ایسا نقادِ فن اُن کو "الحافظ احدالاعلام" لکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے اجلۂ ائمہ سے سماعِ حدیث کیا تھا۔ عمرو بن سلمہ الجرمی۔ ابو العالیہ الریاحی، سعید بن جبیر، ابو قلابہ، عبداللہ بن شقیق، ابن سیرین حمید بن بلال، قاسم بن محمد، عبدالرحمٰن بن القاسم، نافع بن عاصم، عطاء، عکرمہ، اعرج عمرو بن دینار اُن کے شیوخ تھے۔

تلامذہ | اُن کے حلقۂ تلمذ میں جو لوگ شامل تھے اُن میں سے اکثر آسمان علم و فضل پر مہرِ جہانتاب بن کر چمکے، اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

اعمش، قتادہ، حماد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، شعبہ، امام مالک، ابن اسحٰق، سعید بن ابی عروبہ وغیرہم[2] اُن کی مرویات کی تعداد آٹھ سو اور بعض کے نزدیک دو ہزار ہے[3]

مرویات کا پایہ | ثقاہت کے اعتبار سے اُن کی مرویات کا جو پایہ ہے اُس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ شعبہ نے اُن سے کسی ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا۔ اُنہوں نے فرمایا "مجھ کو اس میں شک ہے۔ حضرت شعبہ بولے:۔

شکک احب الیّ من یقین غیرک[4] — آپ کا شک مجھ کو دوسرے کے یقین سے زیادہ محبوب ہے

امام نسائی اُنہیں ثقۃ، ثبت بتاتے ہیں، ابو حاتم فرماتے ہیں "اُن جیسا کوئی ثقہ دیکھا ہی نہیں گیا۔ ابن خیثمہ کہتے ہیں "ایوب ابن عون سے زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں۔ امام مالک فرماتے ہیں:۔

وکان من العالمین العاملین الخاشعین — وہ عالم، عامل اور اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے[5]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۷ و ۳۹۸ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۲ [4] تہذیب التہذیب ج ۱

احتیاط فی الحدیث اس کمالِ ثقاہت کے باوجود وہ حدیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حماد بن زید فرماتے ہیں "میں نے ایوب اور یونس سے زیادہ سوال کا جواب دینے میں کوئی محتاط نہیں دیکھا۔ جواب سے پہلے وہ سائل کے حافظہ کا امتحان کر لیتے تھے کہ کہیں وہ اُسے غلط نقل نہ کر دے۔ حماد بن یزید کا بیان ہے کہ کوئی شخص حضرت ایوب سے کوئی سوال کرتا تھا تو وہ جواب سے قبل اُس سوال کا اعادہ کراتے تھے۔ اگر اس اعادہ میں وہ ذرا بھی خلط ملط اور تغیر کر دیتا تو حضرت ایوب اُس کا جواب نہیں دیتے تھے۔ پھر جواب میں بھی صرف احادیث سُنا دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اپنی طرف سے حکم کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اُن سے کوئی سوال کیا۔ فرمایا "مجھے معلوم نہیں" وہ بولا اپنی رائے ہی بتا دیجئے" ارشاد ہوا "میری رائے بھی کچھ نہیں ہے"[1]

ایک مرتبہ اُن سے پوچھا گیا "آپ رائے سے کام نہیں لیتے؟" اس کے جواب میں فرمایا "کسی نے گدھے سے کہا تو جگالی کیوں نہیں کرتا؟ بولا، میں باطل چیز کا چبانا بُرا جانتا ہوں" اس سے آپ کی غرض یہ تھی کہ اپنی رائے کا ظاہر کرنا بھی ایسا ہی ہے۔

فقہ حدیث کی طرح فقہ کے بھی امام تھے۔ حضرت شعبہ انہیں "سید الفقہاء" کہتے ہیں[1]۔ حماد کہتے ہیں "ہمارے فقہاء ایوب، ابن عون اور یونس ہیں"[2]۔

احترام حدیث طبیعت میں خشوع و خضوع بہت تھا، اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سُنتے ہی رو پڑتے تھے۔ امام مالک فرماتے ہیں "ہم حضرت ایوب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا ذکر آتا تھا، تو بیساختہ رونے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں اُن کی حالت پر رحم آتا تھا"[3]۔

امام مالک ہی ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں "میں نے جب یہ دیکھا کہ ایوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا ادب و احترام کرتے ہیں تو پھر میں نے اُن سے

---

[1] ابن سعد ق ۲ ج ۷ ص ۱۴ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۱ [3] ابن سعد ج ۷ ص ۱۴ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳

حدیثیں لکھنی شروع کر دیں[1]۔

انکساری و تواضع | اس پایہ کے محدث اور فقیہ ہونے کے باوصف مزاج میں انکساری حد سے زیادہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے خائف رہتے تھے کہ علم کا پندار اور عجب وغرور پیدا ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے تھے "کون شخص اس سے محفوظ ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث بیان کرے اور دیکھے کہ اس طرح اس نے جماعت میں کوئی امتیاز پیدا کر لیا ہے، اور اس بناپر اس کے دل میں کوئی عجب پیدا ہو جائے[2]"

علماء کے لئے بڑا ابتلا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی موقع پر کسی مسئلہ کی نسبت اپنی لاعلمی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مگر حضرت ایوب اس سے بالکل مستثنیٰ تھے۔ ان کو کسی مسئلہ کے متعلق علم نہیں ہوتا تھا تو وہ برملا اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔ ابن شوذب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایوب سے اگر کبھی ایسا مسئلہ پوچھا جاتا جس سے وہ واقف نہیں ہوتے تھے تو بے تکلف فرما دیتے "لیسئل اهل العلم" (اہل علم سے دریافت کرو)[3]

شہرت سے نفرت | اس انکساری اور تواضع کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ شہرت سے حد درجہ نفور تھے، یہاں تک عام مجمعوں اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر وہ ایسے راستوں سے جاتے تھے جہاں کوئی انہیں نہ دیکھ سکے۔ حماد بن زید کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ایوب کے ساتھ چل رہا تھا مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ایسے ایسے راستوں سے نکلے کہ میں متحیر تھا، انہیں وہ راستے کس طرح معلوم ہو گئے۔ اور یہ محض اس لئے تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ وہ ایوب جارہے ہیں تاہم راستہ میں اگر کوئی ملجاتا تو سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ لوگ اس کے جواب میں اضافہ کر کے سلام کرتے۔ حضرت ایوب پر اس سے خشوع طاری ہو جاتا تھا اور وہ فرمانے لگتے "اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا، اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا"

وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی اُن کے ساتھ چلے۔ حماد بن زید بیان کرتے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۴ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۴

ہیں "ایک مرتبہ میں بازار جارہا تھا، راستہ میں ایوب مل گئے، وہ ایک جنازہ کے ساتھ جارہے تھے۔ حضرت ایوب کو دیکھ کر میں اُن کے ہمراہ ہوگیا تو فرمانے لگے "تم اپنے بازار جاؤ" شعبہ بیان کرتے ہیں "بسا اوقات میں اپنی ضرورت سے ان کے ساتھ جانا چاہتا تو وہ مجھے اجازت نہ دیتے۔ اور گھر سے نکل کر گلیوں میں اِدھر اُدھر ہوجاتے تھے تاکہ لوگ اُنہیں نہ جانیں[1]"

زہد وعبادت علمی کمال کے ساتھ زاہد و عابد بھی تھے۔ اُنہوں نے چالیس حج کئے تھے۔ امام مالک فرماتے تھے "کان من عباد الناس وخیارھم[2]" (ایوب بڑے عبادت گذار اور بہترین بزرگ تھے) مگر اس کے باوجود فرمایا کرتے تھے "جب صلحاء کا ذکر کیا جائیگا تو میں ان سے الگ ہونگا[3]"

عبادت کا اخفا تمام رات عبادت کرتے رہتے تھے، مگر صبح کے وقت آواز ایسی کرلیتے تھے جس سے معلوم ہوکہ ابھی اُٹھے ہیں[4]۔ اس زمانہ کے عام عابدوں اور زاہدوں کا لباس یہ تھا کہ وہ چست قمیص پہنتے تھے حضرت ایوب میں اخفا کا جذبہ اس قدر تھا کہ اُنہوں نے یہ لباس ہی ترک کردیا تھا۔ اپنی قمیص ڈھیلی ڈھالی رکھتے تھے۔ سعید نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا "ابوعروہ! پہلے زمانہ میں دامن لٹکا کر چلنے میں شہرت تھی اور اب سمیٹ کر چلنے میں ہے[5]"

اُن کا مقولہ تھا کہ انسان کو خواہ کتنا ہی بڑا زاہد ہو اللہ سے ڈرتا رہنا چاہئے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنے زہد کو لوگوں کے لئے عذاب نہ بنائے[6]۔

اہل حکومت سے اجتناب اربابِ حکومت کی ملاقات سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے یہاں تک کہ انہیں کسی خلیفہ کا اپنے مکان پر آنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا "مجھ

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۵ و ۱۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳

[4] ایضاً [5] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۵ [6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔

کو میرا بیٹا اکبر سب سے زیادہ محبوب ہے، مگر اس کے باوجود میں اُسے اپنے ہاتھوں سے دفن کروں۔ یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آئے[1]۔

یزید بن ولید کے ذاتی دوست تھے۔ مگر جب وہ والیِ خلافت ہوا تو آپ نے دعاء کی "اے اللہ! میرے ذکر کو چھپا لے" یعنی اب یزید میری شہرت کی وجہ سے بار بار یاد نہ کرے[2]۔

خوش خلقی اس قدر عابد و زاہد اور شہرت و وجاہت سے نفور ہونے کے باوجود خوش اخلاق بھی انتہا درجہ کے تھے۔ کوئی اُن کے مکان پر آتا تھا تو حتی الوسع اُس کی خاطر مدارات کرتے اور بشاشتِ وجہ کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ حماد بن زید کا بیان ہے "میں نے حضرت سے زیادہ کوئی خندہ رو نہیں دیکھا"[3] عید الفطر کے موقع پر خاص اہتمام کرتے تھے۔ اس دن اپنے تمام پڑوسیوں کے ہاں حصّے بھیجتے تھے[4]۔ جو احباب ملتے تھے اُن سے بڑی گرمجوشی سے ملاقات کرتے تھے۔

ربیع بن مسلم کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ایوب کا ہم سفر تھا۔ ابطح میں ہم قیام پذیر تھے کہ ایک فربہ اندام شخص آیا جس نے اُس وقت موٹا لباس پہن رکھا تھا، اُس نے حضرت ایوب کو دریافت کیا۔ میں نے اطلاع کی، آپ تشریف لائے تو اُس شخص کو دیکھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئے۔ لوگوں نے پوچھا "یہ کون ہیں؟" آپ نے فرمایا یہ "سالم بن عبداللہ ہیں[5]"۔

عیادت و تعزیت آپ کے پاس بہتیرے ایسے آدمی آتے تھے جن سے آپ نا آشنا یا نہ معاملہ کرتے تھے۔ لیکن اگر وہ بیمار ہو جاتے تو آپ اُن کی عیادت کو تشریف لیجاتے اور اُن کا انتقال ہو جاتا تو تعزیت کے لئے اُن کے مکان پر جاتے تھے اور اس درجہ دلسوزی کا اظہار فرماتے کہ وہ شخص آپ کا بہت ہی بڑا اکرم و محترم معلوم ہوتا تھا۔ شام میں ثقیف کے ایک غلام یعلی بن حکیم کا انتقال ہو گیا۔ اُس نے صرف ایک ماں چھوڑی تھی حضرت

---

[1] ابن سعد ج ۷ ص ۱۶ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [4] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶ [5] ایضاً ص ۱۵

ایوب کو خبر ہوئی تو تین دن تک برابر تعزیت کے لئے یعلیٰ کی ماں کے پاس اُس کے مکان پر جاتے رہے، آپ دیر تک وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے تلامذہ واحباب بھی آپ سے ملنے وہیں چلے جاتے تھے[۱]

کرامات بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے آپ صاحبِ کرامات بھی تھے۔ ابو نعیم کا بیان ہے کہ حضرت ایوب مکہ کے راستہ میں تھے۔ اہلِ کارروان کو پیاس لگی، مگر اُنہوں نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ حضرت ایوب نے باصرار دریافت کیا تو انہوں نے افشاء کر دیا۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا "تم کسی پر ظاہر تو نہیں کرو گے"؟ لوگوں نے اقرار کر لیا تو آپ نے ایک دائرہ بنایا، اور دعا مانگی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانی اُبلنے لگا جس سے سب خوب جی بھر کر سیراب ہوئے، اور اُنہوں نے اپنے اونٹوں کو بھی پانی پلایا۔ پھر آپ نے اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پانی اُبلنا بند ہو گیا[۲]

حُلیہ سر پر بڑے بڑے بال رکھتے جس کو سال بسال (غالباً حج کے موقع پر) منڈوا دیتے تھے اور زیادہ بڑے ہو جاتے تھے تو اُن میں مانگ نکالتے تھے، توند بڑھی ہوئی تھی ازار باندھنے پر بھی ناف ظاہر رہتی تھی۔ سر اور داڑھی پر سُرخ خضاب استعمال کرتے تھے[۳]

وفات ۶۳ برس کی عمر میں بمرضِ طاعون بصرہ میں ۱۳۱ھ وفات پائی۔ اُنہوں نے ایک سُرخ چادر عرصہ سے کفن کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اور اُس کو وہ احرام کی حالت میں اور رمضان کی تیسویں شب میں اوڑھتے تھے، مگر یہ اتفاقاً مکہ میں چوری چلی گئی تھی[۴]

---

[۱] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۷ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [۳] ابن سعد ج ۷، ص ۱۴ و ۱۵ [۴] ایضاً ج ۷، ق ۲ ص ۱۶

حضرت مکحول الدمشقی

نام و نسب | مکحول نام، ابو عبداللہ یا ابو ایوب کنیت۔ اُن کے نسب سے متعلق روایات مختلف ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کئی روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسلاً عجمی تھے اور اُن کے والد کا نام سہراب تھا، بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ مصری تھے اور بعض سے اُن کا ہذلی یعنی عرب ہونا دریافت ہوتا ہے۔

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق حضرت مکحول کا خود اپنا بیان یہ ہے کہ میں پہلے عمرو بن سعید بن العاص کا غلام تھا۔ انہوں نے مجھ کو مصر میں قبیلۂ ہذیل کے ایک شخص کو دیدیا۔ اس بیان سے ان دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک سے اُن کا عمرو بن سعید کی غلامی میں ہونا اور دوسری سے ہذلی ہونا ثابت ہوتا ہے[۱]

شوقِ علم | ہذلی نے آزاد کر دیا تو آپ کو تحصیلِ علم کا شوق ہوا۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے طول طویل سفر کئے خود اُن کا اپنا بیان ہے "میں مصر میں اُس وقت تک مقیم رہا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گیا کہ یہاں علم نہیں ہے اور جو کچھ علم تھا وہ میں حاصل کر چکا تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر میں عراق آیا۔ جب یہاں کا تمام علم بھی میں نے حاصل کر لیا تو یہاں سے بھی روانہ ہوا اور سرچشمۂ علوم و معارف مدینہ میں پہنچ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کا سامان کرنے لگا غرض کہ اُنہوں نے طلبِ علم میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان لیا تھا، اور جہاں سے جتنا کچھ علم ملا اُسے اپنے دامانِ شوق میں سمیٹ لیا، وہ خود فرماتے ہیں:۔

طفت الارض فی طلب العلم — میں نے علم کی طلب میں زمین کا چکر لگایا تھا

مدینہ میں جس شانِ انہماک سے اُنہوں نے علم حاصل کیا اُس کو اس طرح بیان کرتے

[۱] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶۱

ہیں:- فلما ادع بھا اعلم الا مدینہ اور عراق میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس
حویت علیہ[۱] کو میں نے حاصل نہ کیا ہو۔

فضل و کمال | اُن کے اس شوق و ذوق اور محنت و جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ "سرخیل علماءِ عصر" بن گئے امام زہری فرماتے تھے "علماء تین ہی ہیں۔ اُن میں سے ایک مکحول ہیں[۲]۔ ابن یونس کہتے ہیں وہ "فقیہ و عالم تھے"۔ ابن عمار اُن کو اہلِ شام کا امام بتاتے ہیں۔ عجلی اُنہیں تابعی ثقہ کہتے ہیں۔ سلیمان بن موسیٰ کہتے تھے مکحول کا علم شام سے ہم تک پہنچا تو ہم نے اُس کو قبول کر لیا[۳]۔

حدیث | جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے اُنہوں نے مدینہ، عراق، شام اور مصر میں علم حاصل کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ اُن کو کن صحابہ سے لقاء حاصل ہے۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اُنہوں نے حضرت انس سے ملاقات کی تھی۔ خود اُن کا بیان ہے کہ میں نے دمشق کی مسجد میں حضرت انس کو دیکھا، میں نے اُن کو سلام کیا اور اُن سے پوچھا کہ جنازہ اُٹھانے اور اُس میں شریک ہونے کے بعد وضو کرنا چاہیے یا نہیں؛ فرمایا "ہم نماز میں تھے اور نماز کی طرف آئے ہیں پھر اس کے درمیان وضو کی کیا ضرورت ہے؟"[۴]

حضرت انس کے علاوہ اُن کے شیوخِ کبار یہ ہیں:-

شیوخ | واثلہ بن اسقع، ابو امامہ، محمود بن الربیع، عبید اللہ بن محیریز، عنبسہ بن ابی سفیان، جبیر بن نفیر، سلیمان یسار، شرجیل بن السمط، طاؤس بن کیسان، عراک بن مالک، کثیر بن مرہ وقاص بن ربیعہ، ام الدرداءِ الصغریٰ[۵] مگر امام شعبی سے خصوصیت کے ساتھ استفادہ کیا تھا۔ اُن کا بیان ہے "لم ار مثلہ" (میں نے اُن جیسا نہیں دیکھا) ان بزرگوں کے علاوہ قاضی شریح کی مجلسوں میں بھی شریک رہے ہیں[۶]۔

تلامذہ | اُن کے خوشہ چینوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اُن میں مشہور یہ ہیں:۔ امام اوزاعی،

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲ [۲] ایضاً [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱ [۴] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۱
[۵] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰ [۶] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۰ و ۱۶۱

عبد الرحمٰن بن یزید، عکرمہ بن عمار، محمد بن الولید الزہری، محمد بن اسحٰق، حجاج بن ارطاۃ، برد ابن سنان، زید بن واقد، ثور بن یزید، ایوب بن موسیٰ، محمد بن راشد، ثابت بن ثوبان وغیرہم

ثقاہت حضرت مکحول کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ فرماتے تھے "جس کسی چیز کو میں اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا تھا، اس کی ضرورت پیش آتی تو فوراً یاد آجاتی تھی" اس بناء پر ملک ملک کی خاک چھاننے کے بعد جو کچھ انہوں نے سنا تھا ان کے خزانۂ حافظہ میں جمع تھا،[۱] علامہ ابن سعد انہیں تابعینِ شام کے تیسرے طبقہ میں شمار کرتے ہیں[۲]۔ ابن یونس کہتے ہیں "ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے"[۳] حافظ ذہبی انہیں تابعین کے تیسرے طبقہ اور کبارِ حفاظ میں شامل مانتے ہیں[۴]۔

فقہ حدیث میں امامت و کمال کے ساتھ وہ فقہ کے بھی مسلم امام تھے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں "میں نے شام میں مکحول سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا"[۵] سعید بن عبد العزیز کہتے تھے: مکحول زہری سے بڑے فقیہ تھے[۶] مروان بن محمد کا بیان ہے کہ کوئی شخص مکحول سے زیادہ فتویٰ میں بصیرت رکھنے والا نہیں تھا[۷]۔ لیکن اس کمالِ تفقہ کے باوجود وہ فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں "وہ اس وقت تک فتویٰ نہیں دیتے تھے جب تک کہ پہلے "لاحول ولا قوۃ الا باللہِ العلی العظیم" نہ پڑھ لیتے تھے اور کسی مسئلہ میں حکم بیان کرنے کے بعد صاف طور سے فرما دیتے تھے" "یہ میری رائے ہے اور خطا بھی ہوتی ہے اور صواب بھی"[۸]۔

خوفِ خدا ان علمی کمالات کے ساتھ اخلاقی و باطنی محاسن سے بھی بحصہ وافر بہرہ اندوز تھے خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ کرا رکھی تھی۔

ربِّ اَعِذ مکحولاً من النار (ابن سعد) اے رب تو مکحول کو دوزخ سے دور رکھ

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲ [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰۔ [۳] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۱۴ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱ [۵] ایضاً ج ۱ ص ۱۰۲ [۶] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۷ [۷] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱ [۸] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۶

انفاق فی سبیل اللہ | حضرت مکحول اُن مجاہدین میں سے تھے جن کو خلافت کی طرف سے وظائف ملتے تھے مگر حضرت مکحول اپنے وظیفہ سے خود جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرتے تھے[1] اور دوسرے مجاہدین کو بھی مدد دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کو کہیں سے دس ہزار دینار کی رقم خطیر ملی تو انہوں نے اس میں سے پچاس پچاس دینار مجاہدین کو گھوڑا خریدنے کے لئے دیئے تھے[2]

ایک الزام اور اس کا ازالہ | مکحول کی نسبت ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ قدریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے علامہ ابن سعد نے بعض ایسی روایتیں بھی نقل کی ہیں جن سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اُن کا دامن اس الزام سے بالکل پاک تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں "تابعین میں سے صرف حسن اور مکحول دو بزرگ تھے جن کے متعلق شہرت تھی کہ قدریہ عقائد رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے ان کے علاوہ حضرت مکحول کے ایک شاگرد سعید بن عبد العزیز بھی اس عقیدہ سے اُن کی برائت کی شہادت دیتے تھے[3] جوزجانی فرماتے ہیں:-

یتوھم علیہ القدر وھو سعی علیہ — اُن پر قدر کا شبہ کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت وہ ان پر اتہام ہے

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "یحییٰ بن معین کہتے تھے کہ مکحول قدری ہیں مگر پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا[4]

عام حالات | مکحول انگوٹھی پہنتے تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ نماز پڑھتے وقت ایک ڈھیلا ڈھالا طیلسان زیب بدن فرماتے تھے، اور زبان میں کچھ لکنت بھی تھی۔

وفات | باختلاف روایت ۱۱۲ھ، ۱۱۳ھ، ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱ [4] ایضاً ص ۲۹۳

منصور بن زاذان

نام ونسب منصور نام، والد کا نام زاذان تھا، عراق کے مشہور شہر واسط کے باشندہ تھے بنو ثقیف کی غلامی میں ہونے کی وجہ سے ثقفی کہلاتے تھے[1]

فضل وکمال حضرت منصور نے اپنے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا اس بنا پر وہ واسط کے جلیل المرتبت علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

وکان ثقۃ حجۃ صالحاً متعبداً کبیر الشان[2]

منصور معتبر، حق کی دلیل، صالح، عبادت گذار اور بڑی شان والے تھے۔

شیوخ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ حضرت حسن بصری کے ساتھ مجالست کی تھی ان کے علاوہ آپ کے اساتذۂ کرام یہ ہیں۔

انس بن مالک، ابو العالیہ الریاحی، محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، میمون ابن ابی شبیب، معاویہ بن قرۃ، حمید بن ہلال، قتادہ، عمرو بن دینار، حکم بن عتیبہ، عبد الرحمٰن بن القاسم، محمد بن الولید بن مسلم العنزی۔

تلامذہ ان کے بھتیجے مسلم بن سعید الواسطی، حبیب بن الشہید، جریر بن حازم، خلف بن خلیفہ، ہشیم، ابو حمزہ، ابو عوانہ وغیرہ ان کے تلامذہ ہیں[3]۔

ثقاہت کیفیت کے اعتبار سے ان کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ عبد اللہ بن احمد اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ منصور شیخ ثقۃ تھے۔ ابن معین، ابو حاتم، اور امام نسائی انہیں ثقہ مانتے ہیں اور عجلی انہیں ثقۃ ثبت کہتے تھے[4]۔

قرآن مجید سے شغف منصور کے صحیفۂ محاسن وکمالات کا روشن باب عبادت وریاضت تھا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶ [4] ایضاً

اُن کو قرآن مجید سے حد درجہ شغف تھا رات کو نماز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کرتے تو چاشت کے وقت تک ختم کر دیتے تھے۔ جب وہ سجدہائے قرآن ادا کرتے تو لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے پورا ایک قرآن ختم کر لیا ہے[1]۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ فجر اور عصر کے درمیان ایک قرآن ختم کر دیتے تھے[2]۔

قرآن مجید حتی الوسع جلد پڑھنا چاہتے تھے مگر پڑھ نہ سکتے تھے۔ ہشام بن حسان کا بیان ہے "ایک مرتبہ میں نے حضرت منصور کے ساتھ مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھی تو میں نے دیکھا کہ دوسری رکعت میں وہ سورۂ نحل تک پہنچ گئے"[3]۔

رمضان میں خصوصیت کے ساتھ یہ شوق تیز تر ہو جاتا تھا، روزانہ کئی قرآن ختم کرتے تھے۔ نماز میں اس زور کا گریہ طاری ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی وجہ سے عمامہ تر ہو جاتا تھا نماز شروع کرنے سے قبل گیارہ سجدے کرتے تھے[4]۔

تجرّد؛ عبادت میں انہماک کے باعث وہ لوگوں سے الگ تھلگ اور علائق دنیوی سے زیادہ تر مجرد رہا کرتے تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں "وکان من المتقشفین المتجردین"[5] ابن عماد الحنبلی انہیں "زاهد البصرة وشيخها" لکھتے ہیں[6]۔

انہوں نے عبادت وریاضت میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کے تلمیذ ہشیم کا بیان ہے کہ وہ اس درجہ کامل تھے کہ اگر اُن سے کہا جاتا کہ موت دروازہ پر کھڑی ہے تو بھی وہ عمل میں کوئی زیادتی نہیں کر سکتے تھے[7]۔

اُن پر خوفِ خدا اس قدر مسلط تھا کہ غم وحزن کو سرورِ مفرط پر ترجیح دیتے تھے خلف بن خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ منصور بسا اوقات فرمایا کرتے تھے "غم اور رنج سے انسان کی نیکیوں میں زیادتی ہوتی ہے؛ اور اس کے برخلاف اکڑنا اور اترانا انسان کی برائیوں میں

۱؎ ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۰ ۲؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۷ ۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴ ۴؎ حلیۃ الاولیاء ابو نعیم ج ۳ ص ۵۸ ۵؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۷ ۶؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۱

اضافہ کا موجب بنتے ہیں[1]"

وفات حضرت منصور اپنے علم و فضل اور زہد و عبادت کی وجہ سے بلا قید ملت و مذہب ہر دلعزیز خلق تھے۔ سنہ ۱۳۱ھ میں مرضِ طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اخیر عمر میں واسط سے ستائیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام مبارک ہے، منصور وہاں منتقل ہو گئے تھے[2] جنازہ اُٹھا تو اس میں ہر مذہب کے آدمی شریک تھے۔ عباد بن عوام کہتے ہیں۔ میں منصورؒ کے جنازہ میں شریک تھا میں نے دیکھا کہ اس میں ایک طرف عیسائی بھی تھے اور ایک طرف یہودی بھی۔ ہجوم اس قدر تھا کہ میرے ماموں نے میرے گم ہو جانے کے ڈر سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا[3]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴ [2] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۸۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴

میمون بن مہران

نام ونسب میمون نام، ابوایوب کنیت۔ والد کا نام مہران تھا۔ مہران بنو نصر بن معاویہ کے مکاتب غلام تھے۔ بدلِ کتابت ادا کرنے کے بعد آزاد ہو گئے تھے۔

پیدائش میمون ۴۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً یہ قبیلۂ ازد کی ایک شاخ ثمالہ کی ایک عورت کے غلام تھے، اُس نے ان کو آزاد کر دیا تھا اس کے بعد بھی یہ کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب محمد بن عبدالرحمٰن اشعث نے حجاج کے خلاف معرکہ آرائی کی جس کو حرب جماجم کہا جاتا ہے، تو میمون کوفہ چھوڑ کر جزیرہ میں آبسے تھے، خود میمون بیان کرتے ہیں کہ جنگ جماجم کا آغاز ۸۰ھ میں ہوا تھا اس حساب سے وہ کم وبیش چالیس سال کی عمر میں جزیرہ منتقل ہو گئے تھے۔

فضل وکمال اُم نمر کی غلامی کے باوجود میمون نے تحصیلِ علم میں کوتاہی نہیں کی اُنہوں نے عمر کے چالیس برس کوفہ میں ہی بسر کئے تھے جو اس وقت اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے صرف ذوقِ خداداد تھا، انہوں نے اکابرِ امت سے استفادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میمون ائمہ روزگار میں سے ہو گئے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "کان ثقة کثیر الحدیث" حافظ ذہبی اُن کو امام و پیشوا قرار دیتے ہیں۔ اور جزیرہ کا نمایاں عالم بتاتے ہیں سلیمان بن موسیٰ الفقیہ کا بیان ہے "ہشام کی خلافت میں چار بزرگ تھے جن کو علماءِ انام کہا جاتا تھا۔ حسن بصری، مکحول دمشقی، میمون بن مہران اور شہاب الدین زہری، ابوالملیح کہتے تھے "میں نے کوئی شخص میمون سے افضل نہیں دیکھا۔"[1]

حدیث فن حدیث میں مسلم الثبوت امام تھے، اُنہوں نے صحابۂ کرام میں ام المومنین حضرت

[1] تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۹۳

عائشہ صدیقہؓ، ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ اور تابعین میں سعید بن جبیرؒ، نافع مولی ابن عمرؒ مقسمؒ مولی ابن عباسؓ، یزید بن عاصمؒ سے استفادہ کیا تھا"۔

تلامذہ اُن کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، مشہور نام یہ ہیں، خود اُن کے فرزند عمرو بن میمون، حمید الطویل، ایوب، جعفر بن برقان، جعفر بن ابی وحشیہ، حبیب بن الشہید، علی بن الحکم البنانی، حکم بن عتیبہ، ابوفروۃ یزید بن سنان الرہاوی۔ حجاج بن تمیم، سالم بن مہاجر، ابوالملیح الرقی[1]۔

اُن کی مرویات کا پایہ کیفیت کے لحاظ سے اُن کی مرویات کا پایہ بلند تھا۔ علامہ ابن سعد کا قول پہلے گذر چکا ہے، ابوعروبہ انہیں تابعین کے حلقۂ اوّل میں شمار کرتے ہیں، احمد کہا کرتے تھے "میمون بن مہران حضرت عکرمہ سے زیادہ ثقہ ہیں[2]" عجلی کہتے ہیں "تابعی ثقہ" ابوزرعہ اور امام نسائی بھی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔

تفقہ فقہ میں وہ تمام علماء جزیرہ میں ممتاز تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

وکان الغالب فی الجزیرۃ فی الفتوی والفقہ[3]

فتوی اور فقہ میں جزیرہ میں سب پر غالب تھے۔

تحصیلِ علم کے زمانہ میں ہی اُن کو فقہ میں اچھی مہارت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں مدینہ میں آیا تو دریافت کیا کہ یہاں کا سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ لوگوں نے حضرت سعید بن المسیب کا نام لیا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوالات کرنے لگا۔ سعید نے فرمایا "تم تو اُس شخص کی طرح سوالات کرتے ہو جو اُن تمام چیزوں کا ماہر ہو جو آج سے پہلے تک یہاں موجود رہی ہیں[4]"۔

لوگوں کو اُن کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ عبدالکریم فرماتے ہیں "اے اہل رقہ ہم کو تمہارا علم نہیں ہے۔ بس جو علم ہمارے پاس میمون بن مہران کی جانب سے آتا ہے ہم اُس کو

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۰ [2] ایضاً [3] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۷۸ [4] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱

قبول کر لیتے ہیں اور جس شخص کو ہم اُن کے جادہ سے منحرف دیکھتے ہیں اُسے رد کر دیتے ہیں[1]"

ان علمی کمالات کے باعث حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایسا مردم شناس بزرگ میمون کا بڑا احترام کرتا تھا۔ آپ میمون کو دیکھتے تو فرماتے "جب میمون اور اُن کے مثل اس دنیا میں نہیں رہینگے تو لوگ مضطرب ہو جائینگے"۔ مگر خود حضرت میمون کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کہا "جب تک آپ اس دنیا میں رہینگے لوگوں کی حالت بہتر رہیگی" آپ نے فرمایا "جاؤ اپنا کام کرو، لوگ تو اس وقت تک بہتر حالت میں رہینگے، جب تک وہ اپنے رب سے ڈرتے رہینگے[2]"

ولایت خراج | میمون اپنی معاش کے لئے کپڑوں کی تجارت کا کام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے عہد خلافت میں ان کی دیانت و امانت پر اعتماد کر کے انہیں خراج وصول کرنے کا مہتمم بنا دیا تھا، لیکن میمون اس درجہ محتاط تھے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنھوں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس اپنا استعفا بھی بھیج دیا تھا، مگر اُس کو بابِ خلافت میں منظور نہیں کیا گیا، اور حضرت عمرؓ نے لکھا "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، صرف درہم کا معاملہ ہے، تم اُس کو حق سے لوگے اور حق کی جگہ ہی میں رکھوگے" اس کے بعد حضرت عمر کی خلافت کے اختتام تک آپ برابر اس کارِ خیر کو انجام دیتے رہے۔ اس سے قبل محمد بن مروان کی طرف سے آپ بیت المال کے سر دفتر تھے۔ میمون خراج کی ولایت کا تمام کام اپنی دکان میں ہی بیٹھ کر انجام دیتے تھے، آپ کے صاحبزادے عمرو بن میمون دفتر کے محافظ تھے۔

حضرت عمر کے بعد یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اُس کے عہد میں بھی چند ماہ تک خراج کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مگر پھر مستعفی ہو گئے۔ بعض دوستوں نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱ [2] ایضاً ص ۳۹۲۔

استعفا واپس لینے کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا "میری آنکھیں جاتی رہتیں"، اور تذکرۃ الحفاظ میں ہے "میری انگلیاں کٹ جاتیں، یہ مجھ کو زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں کسی عہدہ کا انچارج ہوتا" کسی نے دریافت کیا "حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے بھی؟ فرمایا: ہاں! وہ عہدہ حضرت عمر کی طرف سے پیش کیا جاتا یا کسی اور کی جانب سے[1]"

قضا | عہدۂ خراج ہی نہیں، بلکہ حضرت عمر نے میمون کی جامعیت و فقاہت کی قدر کرتے ہوئے انہیں جزیرہ کا قاضی بھی بنا دیا تھا[2]

معصیت سے اجتناب | حضرت میمون پر خشیتِ ربانی کا بڑا غلبہ تھا، ممنوعات سے بہت اجتناب کرتے تھے۔ اُن کے صاحبزادہ عمرو بن میمون کا بیان ہے کہ میرے والد (فرائض کے علاوہ) زیادہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے مگر معصیت کے قریب جانے کو بُرا جانتے تھے[3]۔

عبادت | اگرچہ عموماً وہ فرائض و سُنن کے علاوہ زیادہ عبادت نہ کرتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی ہزار ہزار رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ سترہ دن میں سترہ ہزار رکعتیں پڑھیں[4]۔

سلامت روی | حضرت میمون جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود بیحد سلیم الطبع تھے۔ اگر اپنی کسی رائے کے خلاف کوئی مضبوط دلیل سُنتے تھے، تو فوراً اُس سے رجوع کر لیتے تھے۔ بعض دلائل کی بناء پر آپ کا خیال یہ تھا کہ حضرت علیؓ حضرت عثمان سے افضل ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سلسلہ میں فرمایا "آپ کی کیا رائے ہے، وہ شخص افضل ہے جس نے مال کے خرچ کرنے میں عجلت کی (یعنی حضرت عثمان) یا وہ جس نے خون بہانے میں عجلت کی (یعنی حضرت علی) یہ استدلال سُن کر حضرت میمون نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا، اور فرمایا کہ اب آئندہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہوں گا۔

وفات | ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۱۷ھ میں وفات پائی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عبادت کرنے کے باعث پیٹ میں کوئی سخت تکلیف ہو گئی تھی اس کی وجہ سے انتقال ہوا[5]۔

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۷۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲ [4] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱

سلمہ بن دینار

نام ونسب | سلمہ نام، ابو حازم کنیت۔ فارس کے رہنے والے تھے، والد کا نام دینار تھا۔ اسود ابن سفیان مخزومی کے غلام تھے۔ بعض لوگوں نے ان کو بنو شجع کا غلام بتایا ہے مگر علامہ ابن حجر نے اس کو وہم قرار دیا ہے۔

فضل وکمال | سلمہ نسلاً عجمی اور غلام تھے، مگر اُن کے ذاتی شوقِ علم اور اسلام کے فیضِ مساوات نے اُن کو سر آمدِ روزگار بنادیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "سلمہ واعظ زاہد، مدینہ کے عالم اور شیخ تھے"[1] علامہ نووی انہیں "الفقیہ المشہور بالمحاسن" لکھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ان کی ثقاہت وجلالت اور ثنا پر سب کا اتفاق ہے[2]۔ ابن خزیمہ فرماتے ہیں:-

لم یکن فی زمانہ احدٌ مثلہٗ[3] اُن کے زمانہ میں کوئی اُن جیسا نہیں تھا

حدیث | حدیث کے بڑے حافظ تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "کان ثقۃ کثیر الحدیث"[4]

شیوخ | انہوں نے صحابۂ کرام میں سہل بن سعدی الساعدیؓ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایتیں کی ہیں مگر اُن کے صاحبزادے نے یحییٰ بن صالح سے بیان کیا کہ جو شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ میرے والد نے سہل بن سعدؓ کے علاوہ کسی اور صحابی سے بھی سماع کیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے[5]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں حضرت سہلؓ کے علاوہ کسی اور سے سماع ثابت نہیں ہے۔

غیر صحابی علماء میں ایک جماعتِ کثیر سے روایتیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

ابو امامہ بن سہل بن حنیف، سعید بن المسیب، عامر بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۹ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [4] بحوالہ تہذیب التہذیب ج

بن ابی قتادہ، نعمان بن ابی عیاش، یزید بن رومان، عبیداللہ بن مقسم، ابراہیم بن عبد الرحمٰن ابو صالح السمان، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن، ابن المکندر وغیرہم

تلامذہ | جن بزرگوں نے سلمہ سے روایتیں نقل کی ہیں اور اُن کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہیں اُن میں سے مشہور علماء کے نام یہ ہیں۔

امام زہری، عبیداللہ بن عمرو بن اسحٰق، ابن عجلان، ابن ابی ذئب، مالک، حماد، سلیمان بن بلال، سعید بن ابی ہلال، سفیان ثوری، سفیان بن ابی عینہ، ابو غسان المدنی ہشام بن سعد، وہیب بن خالد، ابو صخر حمید بن زیاد الخراط، اسامہ بن زید لیثی[1] ثقاہت کے اعتبار سے اُن کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ امام احمد بن حنبل، ابو حاتم، عجلی، اور امام نسائی انہیں "ثقہ" کہتے ہیں۔ ابن حبان نے بھی اُن کا شمار ثقات میں کیا ہے[2]

فقہ | فقہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:۔

وکان فقیہ النفس مناقب	سلمہ نفس کے فقیہ تھے اُن کے مناقب
ابی حازم کثیرۃ وکان فقیہاً	بہت ہیں اور وہ فقیہ معتبر تھے، اُن کا علم
ثبتاً کثیر العلم کبیر القدر[3]	بہت اور ان کا مرتبہ بڑا تھا۔

علامہ نووی انہیں "الفقیہ المشہود بالمحاسن" لکھتے ہیں۔ اس کمالِ تفقہ کے باعث ہی چند دنوں تک وہ مدینہ کے قاضی رہے تھے[4]

وعظ | معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ مستقلاً وعظ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں انہیں "القاص الواعظ" (قصہ گو اور واعظ) لکھتے ہیں۔

وسیلۂ معاش | اتنے بڑے عالم کامل ہونے کے باوجود کھجوروں کی تجارت کر کے معاش حاصل کرتے تھے[5]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶ [4] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵

زہد و عبادت | وہ جس طرح علمائے مدینہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے زہد و عبادت کے لحاظ سے بھی اُن میں ممتاز تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں "سلمہ مدینہ کے مشہور عابد و زاہد تھے"[1]

امراء و سلاطین سے استغناء | خود داری کا عالم یہ تھا کہ امراء و سلاطین سے الگ تھلگ رہتے تھے، خود جانا تو درکنار بلائے بھی جانے تب بھی نہیں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری کی وساطت سے خلیفۂ وقت سلیمان بن عبد الملک نے اُن کو بلایا تو آپ نہیں گئے اور یہ کہلا بھیجا "اگر اُس کو مجھ سے کچھ کام ہے تو اُسے میرے پاس آنا چاہیئے۔ رہا میں تو مجھ کو اُس کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے"

حکمت و دانائی | ان اخلاقی و علمی کمالات کے ساتھ قدرت نے انہیں حکمت و فرزانگی سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کے منہ سے حکمت بہ نسبت ابو حازم کے زیادہ قریب ہو"[2] ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ سلمہ کی برابر کسی شخص کے پاس حکمت و وعظ کی باتیں نہیں تھیں[3]

اقوال حکیمانہ | آپ کے بعض حکیمانہ مقولے مشہور ہیں جن کو حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے اُن سے آپ کی حکمت کا اندازہ ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں "ہر وہ عمل جس کی وجہ سے موت کا خوف کیا جاتا ہو اُسے ترک کر دو، پھر تم جب مرو گے تو موت تمہیں ضرر نہیں پہنچائیگی" ایک مرتبہ اُنہوں نے فرمایا کہ "جو شخص اللہ کے اور اپنے تعلق کو درست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے بندگانِ خدا کے درمیانی تعلقات کو بہتر بنا دیتا ہے۔ اور جو شخص اپنے اور اللہ کے تعلق کو خراب رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کے اور دوسرے بندوں کے تعلقات کو خراب کر دیتا ہے، ایک شخص کے ساتھ رکھ رکھاؤ رکھنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام اشخاص کے ساتھ نباہ کی کوشش کی جائے"

ایک مرتبہ خلیفہ ہشام نے آپ سے دریافت کیا "میں امورِ سلطنت کی ذمہ داریوں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۸

سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہوں ؟ فرمایا " یہ تو بہت آسان ہے ، ہر چیز کو اُس کے جائز طریقہ سے حاصل کرو اور پھر جائز مصارف میں ہی خرچ کرو " ہشام بولا " یہ تو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق خاص سے خواہشات نفس سے بری رکھا ہو "[1]

وفات | ۱۴۰ھ میں وفات پائی [2]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ و ۱۲۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶

عبداللہ بن عون

نام و نسب عبداللہ نام ابو عون کنیت، عبداللہ بن درہ کے غلام تھے۔

پیدائش "سیل جارف" سے تین سال قبل پیدا ہوئے [۱]

فضل و کمال کوفہ کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں میں نے ایوب، یونس، تیمی اور ابن عون جیسے فضلا کسی ایک شہر میں یکجا نہیں دیکھے[۲] حضرت شعبہ فرماتے تھے "میں نے ابن عون، ایوب اور یونس جیسا کوئی نہیں دیکھا" عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ عراق میں ابن عون سے زیادہ سنت کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ہشام بن حسان کہتے تھے "میری دونوں آنکھوں نے ابن عون جیسا کوئی نہیں دیکھا[۳] حافظ ذہبی اُن کے علم و فضل کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں۔

لابن عونٍ جلالۃٌ عجیبۃٌ ووقعٌ	ابن عون کی بڑی شان اور دلوں میں بڑی
فی النفوس لانہ کان اماماً فی	وقعت تھی، کیونکہ وہ علم میں اور عبادت و
العلم راساً فی التالّہ والعبادۃ	خدا پرستی میں سردار تھے اپنے انفاس کی حفاظت
حافظاً لانفاسہ کبیر الشانِ [۴]	کرتے تھے (یعنی بیکار وقت ضائع نہیں کرتے
	تھے اور بلند شان والے تھے۔

ابن عماد حنبلی انہیں امام اور شیخ اہلِ البصرۃ وعالمھم لکھتے ہیں [۵]۔

حدیث ابن عون بصرہ کے رہنے والے تھے۔ مگر علمِ حدیث کے شوق میں اُنہوں نے مختلف شہروں کے ائمہ حدیث سے کسبِ فیض کیا تھا اور متعدد مراکز حدیث کے موتیوں کو اپنے دامانِ طلب میں جمع کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے پاس احادیث کا اچھا ذخیرہ

۱؎ ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۵ ۲؎ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷ ۳؎ یہ سب اقوال تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹ سے ماخوذ ہیں ۴؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸ ۵؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰

اکٹھا ہو گیا تھا جو کسی کے پاس نہیں تھا ابن مدائنی فرماتے ہیں "ابن عون کے پاس ایسی عمدہ اسانید جمع ہو گئی تھیں جو اُن کے کسی ساتھی کے پاس نہیں تھیں، انہوں نے مدینہ میں قاسم اور سالم سے، بصرہ میں حسن بصری اور محمد بن سیرین سے، کوفہ میں شعبی اور نخعی سے مکہ میں عطا اور مجاہد سے، شام میں مکحول اور رجا بن حیوٰۃ سے سماعِ حدیث کیا تھا[1]۔ یعنی وہ اس عہد کے تمام بڑے بڑے سرچشمہائے علم و فضل سے سیراب ہوئے تھے۔

اِن بزرگانِ حدیث کے علاوہ انہوں نے جن سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، حافظ ابنِ حجر نے اُن کی ایک طویل فہرست دی ہے، اُن میں سے بعض نام یہ ہیں:۔

ثمامہ بن عبداللہ بن انس، انس بن سیرین، ابراہیم النخعی، زیاد بن جبیر، امام شعبی سعید بن جبیر، موسیٰ بن انس بن مالک، ہشام بن زید بن انس اور حضرت نافع رحمہم اللہ

اِن اکابر اسلام کے فیض نے ابن عون کو بصرہ کا مرجع علم بنا دیا تھا۔ وہیب کہتے تھے بصرہ کا امر صرف چار لوگوں پر منحصر تھا۔ ایوب، یونس، تیمی، ابن عون[2]۔

علامہ ابن سعد انہیں ثقۃ کثیر الحدیث لکھتے ہیں[3]۔ ابن مبارک کہتے تھے کہ میں نے جن جن لوگوں کا تذکرہ سُنا تھا، ملاقات کے بعد سب کو کمتر پایا، بجز ابن عون، ابن سفیان اور حیوٰۃ کے، پھر ان تینوں میں بھی ابن عون کا حال یہ تھا کہ میں چاہتا تھا کہ اُن کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں، اور اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ میں نہ مر جاؤں یا وہ[4]

ابنِ حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں اور اپنے عہد کا سردار کہتے ہیں۔ امام نسائی ایک جگہ انہیں ثقۃٌ مامونٌ اور دوسرے مقام پر ثقۃٌ ثبتٌ کہتے ہیں۔ حضرت شعبہ فرماتے تھے "ابن عون مجھ سے کوئی روایت بیان کریں اور فرمائیں "میرا گمان ہے کہ میں نے یہ سُنا ہے" یہ بالیقین مجھ کو زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اُس روایت کو اُن کے علاوہ کسی دوسرے ثقہ سے سُنوں[5]" اُن پر لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ عثمان بتی کہتے تھے کسی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۶ و ۳۴۷ [3] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۴ [4] تہذیب التہذیب

شخص کی شہادت اُس کے باپ کے حق میں جائز نہیں ہے لیکن ابن عون اس سے مستثنیٰ ہیں[۱]

احتیاط فی الحدیث — کمالِ علم و فضل اور نہایت ثقاہت کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط کرتے تھے، یہاں تک کہ اُنہوں نے راستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ حضرت ابن عون نے مجھ سے کہا کہ "بھتیجے لوگوں نے میرا راستہ بند کر دیا ہے میں اپنی ضرورت کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں آجا سکتا ہوں" بکار کہتے ہیں اس سے ابن عون کی مراد یہ تھی کہ لوگ اُن سے حدیثیں پوچھتے تھے[۲] احتیاط کا یہ عالم تھا کہ احادیث بیان کرتے بھی تھے تو ہر ایک شخص کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے بلکہ جن کو صاحب ذوق و صلاحیت سمجھتے تھے اُن کو احادیث سُناتے تھے۔ بکار کا بیان ہے کہ ابن عون کے صرف چند مخصوص بھائی تھے جن کے سامنے وہ احادیث بیان کرتے تھے اور جماعت کو سماعِ حدیث کی اجازت نہیں دیتے تھے[۳]

محمد بن سیرین ایک مرتبہ اُن کے پیچھے چلنے لگے، غالباً سماعِ حدیث کے لئے ابن عون نے پوچھا "تمہیں کچھ کام ہے؟ بولے نہیں" فرمایا "تو پھر واپس چلے جاؤ"

محمد کے ساتھ ابن عون خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ابن عون انہیں احادیث سُناتے۔ جس کو وہ کہہ دیتے کہ کیا عمدہ ہے، اُسے بیان کرتے تھے۔ اور جس پر وہ یہ نہیں کہتے تھے اُسے بیان نہیں کرتے تھے[۴]

خشوع — احادیث بیان کرتے وقت ایک خاص قسم کا خشوع و خضوع اس خیال سے طاری ہو جاتا تھا کہ کہیں اُنہوں نے حدیث میں زیادتی یا کمی نہ کر دی ہو، اس خشوع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آجاتا تھا[۵]

تلامذہ — روایت میں بڑے محتاط تھے، اس کے باوجود اُن کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، اور

---

[۱] حاشیہ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸ [۲] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً

اُس سے بڑے بڑے ائمہ حدیث پیدا ہوئے۔ مثلاً حضرت اعمش، سفیان ثوری، شعبہ، اور ابن مبارک عام تلامذہ میں قابل ذکر یہ ہیں۔

داؤد بن ہند، یحییٰ القطان، بشر بن المفضل، ازہر بن سعد السمان، معاذ بن معاذ، نضر بن شمیل، یزید بن ہارون، ابو العاصم، محمد بن عبداللہ۔

زہد و ورع | علم و فضل کے ساتھ حضرت ابن عون کے مکارم اخلاق کا طغرائے امتیاز زہد و ورع تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ "میں نے ابن عون کو کبھی کسی سے مذاق کرتے، شعر پڑھتے، اور جھگڑتے نہیں دیکھا۔ انہیں اپنے کام سے کام تھا"[1]

قرہ کہتے تھے "ہم ابن سیرین کے زہد و ورع پر تعجب کرتے تھے مگر ابن عون نے تو اُن کی یاد بھی بھلادی"۔ امام اوزاعی فرماتے تھے "ابن عونؒ اور سفیانؒ کی وفات کے بعد تو سب لوگ برابر ہو گئے"[2] ابن حبان کا بیان ہے کہ "ابن عون عبادت و ریاضت، زہد و ورع، سُنت کی پابندی، ارباب بدعت پر تشدد اور فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سردار تھے"[3]۔ علم کی ذمہ داری شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے، فرماتے تھے "میں چاہتا ہوں کہ علم کی ذمہ داری سے برابر سرابر عہدہ برآ ہو جاؤں"[4]۔ ورع کا یہ عالم تھا کہ کبھی سچی یا جھوٹی[5] قسم نہیں کھائی۔

عقیدہ میں تشدد | صحابۂ کرام کے پاک اور صاف عقائد کے سختی کے ساتھ پابند تھے اور اُن میں مبتدعانہ خیالات کی آمیزش کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے سامنے فرقہ "قدریہ" کا ذکر آیا تو فرمانے لگے "میری عمر اس عقیدہ کی عمر سے زیادہ ہے۔ میں نے دو شخصوں معبد الجہنی اور سنہویہ کے علاوہ اسلاف میں کسی کو اس کا ذکر کرتے نہیں سُنا۔ اس طرح کی خیالات رکھنا شر ہے[5]۔" وہ ایسے لوگوں کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے[6]۔

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷، ۱۴۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸

[4] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵ - [5] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۷ [6] ایضاً ص ۲۵

عبادت اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ جتنا وقت بچتا تھا اس کا بیشتر حصہ عبادت میں گذارتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد قبلہ رو ہوکر بیٹھ جاتے اور ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔ آفتاب کے طلوع ہوجانے پر نماز پڑھتے اور پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھتے، اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ غسل کرکے بہترین لباس زیب تن فرماتے خوشبو لگاتے اور نماز جمعہ کے لیے نہ تو بہت پہلے جاتے اور نہ بالکل اخیر میں، بلکہ ہر امر میں اعتدال مرعی رکھتے تھے۔ جامع مسجد کبھی پاپیادہ آتے اور کبھی سواری پر آتے تھے، جمعہ کے فرض مسجد میں پڑھتے تھے اور سنن و نوافل گھر پر پڑھتے تھے۔ رمضان میں عبادت اور بڑھ جاتی تھی، فرض نماز باجماعت پڑھ کر گھر چلے آتے اور تنہائی میں عبادت کرتے یہ اُن کا معمول تھا جس میں وفات کے وقت تک فرق نہیں آیا[۱]

لہسن سے اجتناب لہسن سے منہ میں ایک طرح کی بدبو پیدا ہوجاتی ہے۔ حضرت ابن عون عبادت زیادہ کرتے تھے، اس لئے وہ لہسن سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اُن کو اگر کسی کھانے میں لہسن کا اثر بھی محسوس ہوجاتا تھا تو اُس کو نہیں چکھتے تھے۔

جہاد فی سبیل اللہ زہد و عبادت کے ساتھ اُن میں جہاد کا بھی بڑا ولولہ تھا۔ خاص اسی مقصد کے لئے اُنہوں نے ایک اونٹنی پال رکھی تھی۔ علامہ ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُنہوں نے ایک رومی سے جنگ کرکے اُس کو قتل کردیا تھا۔

احسان میں اخفاء لوگوں پر احسان کرتے تھے، مگر بڑے اخفاء کے ساتھ۔

اخلاق عام لوگوں کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، حلم اور بردباری میں نمایاں

[۱] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶ و تذکرۃ الحفاظ

مقام رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے غلام نے اُن کی ناقہ کے چہرہ پر مار دیا جس سے اُس کی آنکھیں نکل آئیں۔ ابن عون نے ناقہ کو اس حال میں دیکھا تو غلام سے صرف یہ فرمایا "کیا مارنے کے لئے ناقہ کا صرف چہرہ ہی رہ گیا تھا۔ اللہ تجھ کو برکت دے۔ تو میرے پاس سے چلا جا، جا تو آزاد ہے"

بکار کا بیان ہے کہ میں نے ابن عون کے ساتھ عرصہ دراز تک مصاحبت کی ہے۔ میں نے کسی شخص کو اُن سے زیادہ زبان پر قابو رکھنے والا نہیں دیکھا۔ وہ اپنی لونڈی غلاموں بلکہ مرغی بکری تک کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے۔

لونڈی غلام تو پھر بھی اپنے ہی تھے۔ وہ دشمنوں کو بھی بُرا نہیں کہتے تھے۔ ابن عون نے ایک عربی عورت سے شادی کرلی تھی، اس جرم میں بلال ابن بردہ نے اُن کو زدو کوب کرایا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے بلال کے متعلق کبھی ایک حرف بُرا نہیں کہا۔ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے کہا کہ بلال نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا "ایک آدمی مظلوم ہوتا ہے مگر پھر وہی ظلم کی شکایت کرکے ظالم بن جاتا ہے۔ تم میں سے کوئی بھی بلال کے متعلق اتنا سخت نہیں ہے جتنا کہ میں ہوں۔ لیکن میں اس کے ظلم کی شکایت کرکے ظالم نہیں بنونگا"

پہلے گذر چکا ہے کہ ابن عون لہسن بالکل نہیں کھاتے تھے۔ بکار بن محمد کی ایک باندی عینا حضرت ابن عون کی خدمت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے آپ کے لئے کھانا تیار کیا جس میں لہسن ڈالدیا۔ حضرت ابن عون کے سامنے کھانا آیا تو لہسن کی بو سونگھ کر کھانے سے دستکش ہوگئے اور ناگواریِ طبع کے باوجود اُس سے صرف یہ کہا "اللہ تم کو برکت دے۔ تم اس کھانے کو میرے پاس سے اُٹھالو" عینا کہتی ہے کہ "میں نے کھانا تو اُٹھالیا مگر ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے اور بھاگ

کر میں نے سیرین کے گھر میں پناہ لی۔[1]

علالت آپ کو ذاتِ نبوی کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی، بڑی آرزو رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ خواب میں ہی جمالِ جہاں افروز نبوی کے دیدار سے شاد کام ہو جائیں اُن کی یہ تمنا بر آئی اور وہ خواب میں دیدارِ جمال نبوی سے مشرف ہوئے۔ اس شرف پر ایسے وارفتہ ہوئے کہ بالاخانہ سے اُتر کر مسجد میں آنا چاہتے تھے کہ گر پڑے۔ پیروں میں چوٹ آئی، مگر آپ نے اُس کا علاج نہیں کرایا۔

وفات آخر کار یہ چوٹ ہی مرض الموت کا سبب بن گئی۔ آپ بیماری میں نہایت صابر وشاکر رہتے تھے زبان پر حرف شکایت نہیں لاتے تھے۔ بکار بن محمد کہتے ہیں "ابن عون بیماری کی حالت میں تندرستی سے زیادہ شاکر رہتے تھے"۔ آخری سانس تک قبلہ رو ہوکر خدا کا ذکر کرتے رہے۔ انجام کار اس قید ہستی سے نجات پائی اور ۱۵۱ھ میں واصل الی اللہ ہو گئے۔

جنازہ جنازہ اٹھا تو اس شان سے کہ بیشمار خلقت شریک جنازہ تھی۔ مسجد کا صحن اور اس کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور محراب میں رکھ کر نماز پڑھائی گئی۔

بارگاہ نبوت میں مقبولیت حضرت ابن عون کو ذات نبوی کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی اُس کی مقبولیت کی سند یہ ہے کہ ابن عون کی زندگی میں بعض لوگوں نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں "ابن عون کی زیارت کرو"

ترکہ ترکہ میں نقد روپیہ کچھ نہیں چھوڑا، صرف دو مکان تھے، مرض الموت میں پانچویں حصہ کی وصیت اعزا کے لئے کر گئے تھے۔ دس ہزار کا قرض چھوڑا تھا، اس کو ادا کرنے کے بعد وصیت پوری کر دی گئی۔

حلیہ خدا نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت بھی دیا تھا۔ پھر مزاج بھی لطیف و نفیس

---

[1] یہ سب واقعات ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶، ۲۷، ۲۸ سے ماخوذ ہیں۔

پایا تھا۔ نرم اور باریک کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو کا استعمال کثرت سے کرتے تھے پورا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتے تھے۔ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے تو خادم تولیہ پیش کرتا اور آپ اُس سے ہاتھ منہ صاف کرتے تھے [۱]

[۱] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶ - ۲۹ - ۳۰ -

عمرو بن دینار

نام ونسب | عمرو نام، ابو محمد کنیت۔ باذان کے غلام تھے۔

پیدائش | ۴۶ھ یا اس کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

علم وفضل | حضرت عمرو اس عہد کے اکثر دوسرے علماء وفضلاء کی طرح اگرچہ غلام تھے، لیکن اسلام نے غلاموں کو کسب فضل وکمال کے جو مواقع عنایت فرمائے ہیں، حضرت عمرو اس کی ایک روشن مثال تھے۔ اکابر امت اُن کی جلالتِ علم کے مقر ہیں۔ حافظ ذہبی انہیں الحافظ الامام اور عالم الحرم لکھتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں: "ان کی جلالت امامت اور ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے وہ ائمہ تابعین میں سے تھے۔"

حضرت عمرو بن دینار کا علم نہایت وسیع تھا اور اس کی شہرت دور دور تھی۔ طاؤس نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ "مکہ جاؤ تو عمرو بن دینار سے ضرور ملنا اُن کے کان علماء کے لئے خریطہ ہیں" (کہ جو سنتے ہیں سب سینہ میں محفوظ کر لیتے ہیں)[1] ابن مہدی کہتے ہیں۔ حضرت شعبہ فرماتے تھے "میں نے عمرو بن دینار ایسا کوئی نہیں دیکھا"[2]

حدیث | حدیث اُن کا خاص فن تھا۔ علامہ ذہبی انہیں حافظِ حدیث تسلیم کرتے ہیں اور علامہ ابن سعد فرماتے ہیں۔[3]

کان عمرو ثقة ثبتا کثیر الحدیث — عمرو ثقہ تھے، ثبت اور کثیر الحدیث تھے۔

صحابہ میں انہوں نے جلیل القدر اساطین امت سے فیض حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۴

ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، ابو الطفیل، سائب بن یزید رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور تابعین میں حضرت سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، طاؤس بن کیسان۔ عطاء بن ابی رباح، سالم بن عبداللہ، مجاہد، محمد بن علی۔ ابن ابی ملیکہ، سلیمان بن یسار اور امام زہریؒ وغیرہ سے حدیث سُنی تھی۔

تلامذہ | جنہوں نے اُن سے استفادہ کیا، اُن میں زیادہ مشہور اور قابل ذکر یہ ہیں: ابن جریج دونوں حماد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری اور ورقاء۔

مرویات کا پایہ | ثبت اور ثقاہت کے لحاظ سے اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مسعر سے کسی نے اُن کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ثقۃٌ ثقۃٌ ثقۃٌ۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں "میں نے اُن سے زیادہ صاحب تثبت کوئی نہیں دیکھا[۱]۔ سفیان نے ایک مرتبہ سعد سے پوچھا "آپ نے حدیثوں میں سب سے زیادہ متقن کس کو پایا؟" فرمایا عمرو بن دینار، اور قاسم بن عبدالرحمٰن کو"۔ ابن عیینہ اور جبیر انہیں ثقۃٌ ثبت صدوق کثیر الحدیث کہتے تھے[۲]۔

حضرتِ عمرو بن دینار کی ذات مشتاقانِ حدیث کے لئے مرکز توجہ تھی۔ لوگ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر اُن کی روایات لکھتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں۔ "ایوب مجھ سے پوچھتے تھے کہ عمرو بن دینار نے فلاں شخص سے کیا کیا حدیثیں بیان کی ہیں میں اُن کو بتانے کے بعد پوچھتا "کیا آپ لکھنا چاہتے ہیں" وہ کہتے "ہاں[۳]" سفیان فرماتے تھے "جو حدیث میں عمرو بن دینار سے سُنتا ہوں وہ مجھ کو اُس حدیث سے زیادہ محبوب ہے جس کو بیس آدمیوں سے سُنوں[۴]"۔

روایت بالمعنیٰ | غایت احتیاط فی النقل کی وجہ سے وہ بسا اوقات روایت بالمعنیٰ کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وکان یحدّث علی المعنیٰ[۵]"۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۰۷ [۲] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۰ [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [۴] تہذیب الاسماء

احتیاط | حضرت عمرو بن دینار خاص خاص تلامذہ کو احادیث قلمبند کرنے کی اجازت دیدیتے تھے۔ چنانچہ حضرت سفیان فرماتے ہیں "میں نے ایوب کے لئے اطراف حدیث لکھی تھیں پھر اُن سے متعلق میں نے عمرو بن دینار سے سوال کیا۔ لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر لکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ معمر کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے عمرو بن دینار سے سُنا، فرما رہے تھے "لوگ ہم سے ہماری رائے دریافت کرتے ہیں، ہم اُن کو بتا دیتے ہیں، اور وہ اُس کو پتھر کی لکیر جان کر قلمبند کر لیتے ہیں (حالانکہ ان کو ایسا نہیں چاہئے کیونکہ) ممکن ہے ہم اُس سے رجوع کر لیں"۔ ایک دفعہ کسی نے اُن سے کہا کہ "سفیان لکھتے ہیں" آپ یہ سن کر لیٹ گئے اور رونے لگے اور فرمایا "جو شخص مجھ سے سُن کر لکھتا ہے وہ مجھے تنگی میں مبتلا کرتا ہے"۔ سفیان کہتے ہیں "یہ سُن کر میں نے وہ بات نہیں لکھی جس کو ہم یاد کر سکتے ہوں"[1]۔

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ علامہ نووی اُن کو مجتہد اصحاب مذہب میں شمار کرتے ہیں[2]۔ ابن ابی نجیح کہتے ہیں "میں نے عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہہ کسی کو نہیں دیکھا، نہ طاؤس کو، اور نہ عطاء و مجاہد کو۔ ابن ابی عیینہ فرماتے ہیں

ماکان عندنا افقہ۔ ولا اعلم ولا احفظ من عمرو بن دینار[3] — ہمارے پاس عمرو بن دینار سے بڑا نہ کوئی فقیہ تھا نہ عالم اور نہ زیادہ حفظ حدیث والا۔

مرکزِ علم مکہ کے مفتی[3]، لیکن اس کمالِ تفقہ کے باوجود فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ کسی مسئلہ میں اگر انہیں ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اُس کے متعلق لب کشائی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے کسی چیز کی نسبت کوئی سوال کیا، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سائل بولا "میرے دل میں اس مسئلہ کے بارہ میں چند شبہات ہیں" آپ نے فرمایا "بخدا تمہارے دل میں ابو قبیس (پہاڑ)

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ قسم اول ص ۲۷ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷

کی مانند کسی شک کا ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میرے دل میں بال برابر بھی شک ہو (یعنی مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے)[۱]

عبادت | علم و فضل میں نمایاں مقام رکھنے کے ساتھ بڑے عبادت گذار بھی تھے۔ وہ رات کے ایک حصہ میں سوتے تھے، ایک تہائی شب درسِ حدیث میں بسر کرتے تھے اور ایک تہائی رات نماز پڑھتے رہتے تھے[۲]

جماعت کی پابندی | نمازِ جماعت کے بڑے پابند تھے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں جبکہ نہایت درجہ ضعف و نقاہت کی وجہ سے اپاہج ہو گئے تھے، گدھے پر سوار ہو کر مسجد جاتے تھے جو اُن کے مکان سے کافی فاصلہ پر تھی۔ پھر گدھے پر بھی خود سوار نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اُن کا کوئی خادم یا شاگرد سوار کرتا تھا۔ سفیان کا بیان ہے کہ عمرو بن دینار کسی حالت میں بھی مسجد میں آنا ترک نہیں کرتے تھے۔ اُن کو گدھے پر سوار کر کے لیجایا جاتا تھا اُس وقت میں کمسنی کی وجہ سے اُنہیں اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ پھر میں بڑا ہو کر اُن کے اُٹھانے پر قادر ہو گیا، اُن کا گھر مسجد سے دور تھا[۳]

خلوص و للّٰہیت | خلوص و للّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی مذہبی و علمی خدمات پر کسی قسم کا کوئی معاوضہ یا وظیفہ لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں "ایک مرتبہ ابن ہشام نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کا وظیفہ جاری کئے دیتا ہوں آپ اطمینان سے گھر بیٹھے ہوئے فتوے دیتے رہئے۔ میں نے کہا "کہ میں ایسا نہیں چاہتا" چنانچہ وہ اخیر دم تک یونہی بلامعاوضہ خدمات انجام دیتے رہے[۴]

سادگی | مزاج میں بیحد سادگی تھی، کبرسن کے باعث سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے لیکن آپ نے خضاب لگانا پسند نہیں کیا[۵]

وفات | ۱۲۶ھ میں وفات پائی، آپ کے بعد افتاء کی خدمت عبداللہ بن ابی نجیح کے سپرد ہو گئی۔ اس وقت آپ کی عمر اسّی برس کی تھی[۶]

[۱] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۲ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷، [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷، ۱۰۸

سلیمان بن طرخان تیمی

نام ونسب | سلیمان نام، ابو معتمر کنیت۔ نسباً مری تھے، بنو تیم میں بسلسلۂ غلامی سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسی وجہ سے حافظ ذہبی انہیں مولاہم البصری، اور ابن عماد الحنبلی انہیں "التیمی القیسی" لکھنے کے بعد "مولاہم" لکھتے ہیں۔

علم وفضل | علم وکمال کے اعتبار سے وہ بصرہ کے علمائے اعلام میں سے تھے۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی انہیں حافظ، امام، اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں[1]۔

حدیث | حدیث کے ممتاز حافظ تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں "وکان ثقة کثیر الحدیث" اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے حفظ واتقان کے معترف ہیں۔ حضرت سفیان فرماتے تھے۔ بصرہ کے حفاظ یہ ہیں۔ سلیمان التیمی، عاصم الاحول، داؤد بن ابی ہند

شیوخ | صحابۂ کرام میں انہوں نے حضرت انس بن مالک رضؓ اور تابعین میں حسن بصری، ابو عثمان، طاؤس، اعمش، قتادہ، اور ابو اسحاق سبیعی سے استفادہ کیا تھا۔

تلامذہ | ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا، ممتاز تلامذہ یہ ہیں:۔ شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابن المبارک، یزید بن ہارون اور ہوذہ بن خلیفہ۔ ابن علیہ، ابراہیم بن سعد، جریر وغیرہم

مرویات کا پایہ | ثقاہت کے اعتبار سے وہ مسلّم تھے، شعبہ کا بیان ہے کہ "میں نے سلیمان سے زیادہ کوئی سچا نہیں دیکھا، وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو اُن کا رنگ بدل جاتا تھا[2]۔"

حافظ ذہبی نے اُن کی مرویات کی تعداد دو سو بتائی ہے[3]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۴۲ وشذرات الذہب ج اص ۱۲۱ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۴۲

عبادت و ریاضت

حضرت سلیمانؒ کا اصل طغرائے امتیاز عبادت وریاضت تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "وکان من العباد المجتہدین" ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں۔

وکان عابداً صواماً قانتاً للہ قواماً	سلیمان عابد، صائم النہار، خدا کے مطیع و فرمانبردار اور قائم اللیل تھے۔

رات رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ لبسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ صبح کی نماز رات کے وضو سے ہی پڑھتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے معتمر اور وہ خود رات میں مسجدوں کا چکر لگا کر کبھی نماز کسی مسجد میں پڑھتے اور کبھی کسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ صبح تک یہی کرتے رہتے تھے[1]

سعید بن عامر الضبعی کا بیان ہے کہ ہر سجدہ میں ستر مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے ایک روایت ہے کہ عصر سے مغرب تک تسبیح پڑھتے رہتے تھے، نماز کے علاوہ روزوں کا بھی حال یہی تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ روزہ رکھتے تھے، اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔

صدقہ وخیرات

صدقہ وخیرات کثرت سے کرتے تھے۔ جریر کہتے ہیں "سلیمان پر کوئی ساعت ایسی نہیں آتی تھی کہ وہ اُس میں خیر خیرات نہ کرتے ہوں۔ اگر صدقہ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا تو دو۲ رکعت نماز ہی پڑھ لیتے تھے" غرضکہ وہ خدا کی اطاعت، اور بندگی سے کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتے تھے۔ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ "جب کبھی بھی سلیمان کے پاس ایسے وقت آتے جبکہ خدا کی عبادت کی جا سکتی، تو ہم اُنہیں خدا کی عبادت کرتے ہوئے ہی پاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن میں معصیت کا مادہ ہی نہیں ہے"

مواخذہ کا ڈر

اس قدر زہد و عبادت کے باوجود مواخذہ آخرت سے ہمیشہ خائف رہتے تھے اُن سے کسی نے کہا "سلیمان! آپ تو آپ ہی ہیں۔ آپ کے مثل کون ہوگا؟" بولے

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲ [2] ابن سعد ج ۷۔ ق ۲ ص ۱۸۔

"السیاۃ کہو، مجھ کو نہیں معلوم میرے رب کی طرف سے آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔
اُس نے خود فرمایا ہے۔ "بدا لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون" اللہ کی طرف سے اُن
کے لئے وہ بات ظاہر ہوگی جس کا اُنہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

قدریہ سے نفرت | الحب فی اللہ والبغض فی اللہ اُن کا شعار تھا۔ اسی بنا پر قدریہ فرقہ سے بہت
بغض رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں رونے لگے۔ کسی نے سبب پوچھا
تو فرمایا:۔ "ایک دفعہ میں نے ایک قدری کے پاس سے گذرتے ہوئے اُسے سلام
کرلیا تھا۔ اب ڈرتا ہوں کہ کہیں اس پر مواخذہ نہ ہو" حضرت سلیمان کا یہ عام قاعدہ
تھا کہ کوئی شخص اُن کے پاس حدیث سُننے کے لئے آتا تو وہ پہلے اُس کا امتحان لیتے
اُس سے دریافت فرماتے کہ کیا زنا کا فعل بہ تقدیر الٰہی ہے؟ وہ کہتا "ہاں" پھر آپ اُس
سے اس پر قسم لیتے اور اگر وہ قسم کھالیتا تو آپ اُسے پانچ احادیث سُناتے تھے۔

نکتہ وری | ہر زمانہ میں ایسے افراد رہے ہیں جو مذہب کے معاملہ میں خصوصاً سہولت پسندی
سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی خاص امام کی تقلید یا کسی خالص عالم کے مسلک کی پیروی
پسند نہیں کرتے۔ بلکہ جس امام کے مسلک میں اُنہیں جو بات آسان معلوم ہوتی ہے۔ اُسے
اختیار کر لیتے ہیں اور دل کی تسلی کے لئے عذر یہ کر دیتے ہیں کہ ہر امام برحق ہے۔ اس
طرح کے سہولت پسند افراد سے متعلق حضرت سلیمان التیمی نے کیا عجیب دیدہ ورانہ بات
کہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اگر تم ہر عالم کی رخصت یا اُس کی لغزش کو اختیار کرنے لگو گے تو تم میں تمام شہری شر
پیدا ہو جائیگا"[1]

وفات | ماہ ذوالقعدہ ۱۴۳ھ میں وفات پائی اُس وقت ستاون ۵۷ سال کی عمر تھی[2]۔

[1] صدقہ و خیرات کے عنوان سے یہاں تک کی سب معلومات تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲ و ۱۴۳ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۸ و تذکرۃ الحفاظ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۱۔

حسن بصریؒ

نام ونسب | حسن نام، ابو سعید کنیت، والد کا نام یسار تھا۔

غلامی | ان کے والدین غلام تھے، اس بارہ میں روایتیں مختلف ہیں۔ ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔ ربیع بنت نضر نے اُن کو خرید کر آزاد کر دیا تھا، دوسری روایت میں یہ ہے کہ اُن کے والدین ایک انصاری کی غلامی میں تھے، انہوں نے بیوی کے مہر میں بنو سلمہ کو دیدیا تھا جنہوں نے ان کو آزاد کر دیا۔ تیسری روایت یہ ہے کہ اُن کے والد زید بن ثابت کے غلام تھے اور اُن کی والدہ جن کا نام خیرہ تھا اُم المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں[1]۔ اور واقعاتِ مابعد سے معلوم ہوگا کہ یہی روایت زیادہ صحیح ہے۔

ولادت اور بچپن | ۲۲ھ[2] میں یعنی حضرت عمرؓ کی شہادت سے تقریباً دو سال پہلے مدینہ میں پیدا ہوئے جیساکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے ان کی والدہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں اس تقریب سے حضرت حسن کو اُم سلمہؓ کے گھر میں تربیت پانے کا موقع ملا اُن کی والدہ کسی کام سے باہر چلی جاتیں یا گھر میں ہی کسی کام میں مشغول ہوتی تھیں تو حضرت

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۱۵۔ [2] حضرت حسن بصری کی صحیح تاریخ ولادت کوئی نہیں لکھتا صرف اتنا لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ختم ہونے میں دو سال کی مدت باقی تھی کہ حضرت حسن پیدا ہوئے پھر حافظ ذہبی وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۱۰ھ میں حسن بصریؒ کا انتقال ہوا تو اُنکی عمر اُس وقت اٹھاسی سال کی تھی اب اس میں اشکال یہ ہے کہ ۱۱۰ میں سے ۸۸ گھٹا دے جائیں تو ۲۲ھ نکلتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کی وفات ذی الحجہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے اس لحاظ سے صرف ایک سال کا فرق رہتا ہے اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر کی شہادت ۲۳ھ کے آخری حصہ میں ہوئی تھی اور حضرت حسن بصری ۲۲ھ کی اوائل میں پیدا ہوئے ہونگے۔ تھوڑے دنوں کا فرق ایسا کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ تقریباً دو برس کو راوۃ

نے دو برس سے تعبیر کر دیا۔

ام سلمہ حضرت حسن کو دودھ پلا دیتی تھیں[1]۔ بے شبہ یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ کسی خوش نصیب کو ہی مل سکتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں "حضرت حسن میں جو غیر معمولی فصاحت اور حکمتیں پائی جاتی تھیں یہ سب اسی مقدس شیر خوارگی کے طفیل میں تھیں[2]"۔

حضرت ام سلمہؓ کے تعلق سے حسن کو دوسری ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آنے جانے کا موقع ملتا تھا، خود اُن کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت تک جبکہ اُن کی عمر تیرہ سال کی تھی وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں بے تکلف آتے جاتے تھے۔

علم و فضل حسن ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ صحابۂ کرام کی بڑی تعداد بقید حیات تھی پھر اُن کی تربیت بھی ایسے مقام پر ہوئی تھی، جہاں دن رات علم و دین کے چرچے رہتے تھے اور خود اُن کے اندر فطری استعداد و صلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم و عمل، فضل و کمال زہد و اتقاء اور تمام اخلاقی و روحانی کمالات، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے اُن کا دامن پُر نہ ہو۔ علامہ ابن سعد نے ان کے تمام اوصاف ایک سطر میں جمع کر دیے ہیں فرماتے ہیں:۔

كان عالماً رفيعاً ثقةً حجةً ماموناً	حضرت حسن عالم، بلند مرتبہ، معتمد، برہان،
عابداً ناسكاً كثير العلم فصيحاً	نیک خصلت، عبادت گذار، وافر العلم فصیح،
جميلاً وسيماً[3]	خوبصورت، اور خوش رو تھے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

حافظٌ علامةٌ من بحور العلم فقيه	حسن حافظ، علامہ، علم کا سمندر، نفس کے
النفس كبير الشان عديم النظير	فقیہ، بڑے شان والے، بے نظیر پسندیدہ
مليح التذكير بليغ الموعظة	وعظ کہنے والے خوب نصیحت کرنے والے

[1] تہذیب الاسماء واللغات ق ۱ ج ۱ ص ۱۶۱ [2] ایضاً [3] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۱۵

راسٌ فی انواعِ الخیر [1]   تمام انواع خیر میں سردار تھے۔

تفسیر: تفسیر کی تعلیم اُنہوں نے بڑی محنت اور شوق سے حاصل کی تھی۔ ابوبکر الہذلی بیان کرتے ہیں "ایک دن مجھ سے سفاح نے دریافت کیا کہ تمہارے حسن اس بلند مرتبہ کو کس طرح پہنچ گئے؟" میں نے کہا "انہوں نے بارہ برس کی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب تک ایک سورۃ کی تفسیر و تاویل اور اُس کی شانِ نزول معلوم نہیں کر لیتے تھے دوسری سورت نہیں پڑھتے تھے [2]۔

حدیث: حدیث کی سماعت اُنہوں نے اُن اساطین اُمت سے کی تھی جو مدینہ میں اس فن کے مرجع خلائق بزرگ تھے۔ صحابہ میں حضرت عثمان رضؓ، حضرت علی رضؓ، ابوموسیٰ اشعری رضؓ، عمران بن الحصین رضؓ، عبداللہ بن عمر رضؓ، عبداللہ بن عباس رضؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ، حضرت معاویہ رضؓ، انس رضؓ، جابر رضؓ اُن کے شیوخ تھے۔

بعض لوگوں کو حضرت حسن بصری پر یہ اعتراض تھا کہ وہ تدلیس کرتے ہیں یعنی اپنے اصلی شیخ کا نام نہیں لیتے اور حدیث کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ لیکن اُس کی وجہ جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں یہ تھی کہ اُن کے عہد میں حجاج کے مظالم اور اس کی سفاکیوں کا بڑا چرچا تھا، حضرت حسن رحؒ فرماتے ہیں "میں جس کسی حدیث میں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتا ہوں، سمجھ لو کہ وہ میں نے حضرت علی رضؓ سے سُنی ہے، لیکن (حجاج کی وجہ سے) میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں کہ حضرت علی رضؓ کا نام نہیں لے سکتا۔" غالباً حضرت حسن سے استفادہ کرنے والے اس راز کو جانتے تھے اور وہ اُن کے ایسا کرنے پر پوچھ گچھ نہیں کرتے تھے۔ یونس بن عبید نے اُن سے ایسا سوال کیا تو فرمایا "اے میرے بھتیجے آج تم نے مجھ سے ایک ایسی بات دریافت کی ہے جو آج تک کسی نے دریافت نہ کی تھی اور اگر تمہاری منزلت میرے دل میں نہ ہوتی تو میں

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶۔

اس بھید کو تم سے بھی بیان نہ کرتا۔"[1]

اکابر علماء کی رائے | بہرحال وہ بڑے بڑے علماءِ عصر کے نزدیک معتبر اور ثقہ تھے۔ اور وہ اُن سے حدیثیں سنتے تھے۔ انس بن مالک کہا کرتے تھے "حسن سے دریافت کرو، اُن کو سب کچھ محفوظ ہے اور ہم تو بھول گئے۔" عاصم الاحول کا بیان ہے "میں نے شعبی سے کہا کہ میں بصرہ جا رہا ہوں، آپ کو وہاں کا کوئی کام ہو تو بتائیے" بولے "تم بصرہ پہنچو تو حسن کو میری طرف سے سلام کہنا" میں نے کہا "میں تو اُن کو پہچانتا نہیں ہوں" فرمایا "تم بصرہ میں داخل ہو تو دیکھنا وہاں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش رو اور پُرعب کون ہے بس وہی حسن ہوں گے تم اُن سے میرا سلام کہہ دینا"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بصرہ کی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت حسن کو دیکھا وہاں تشریف رکھتے ہیں اور لوگوں کا ایک جمِ غفیر اُن کے اردگرد بیٹھا ہوا ہے سلیمان التیمی کہتے تھے "حسن شیخ بصرہ ہیں"، مطر الوراق کا قول تھا کہ جابر بن زید اہل بصرہ میں سب سے بڑے بزرگ مانے جاتے تھے، پھر جب حسن آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ آخرت میں ہیں اور وہاں کی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اُن کے متعلق خبریں دے رہے ہیں[2]۔ عطا ابن ابی رباح خود جلیل القدر محدث ہیں وہ فرماتے تھے "تم اس شخص (حسن) کی طرف رجوع کیا کرو، وہ بہت بڑے عالم، امام اور مقتدا ہیں"[3]

تلامذہ | علم و فضل کی اس عام شہرت کی وجہ سے اُن کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ ایوب، قتادہ، بکر بن عبداللہ مزنی، عطاء بن السائب، یونس بن عبید، منصور بن زاذان، مجاہد، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان[4]۔

فقہ | تفسیر و حدیث کے علاوہ وہ فقہ کے بھی بڑے وسیع النظر امام تھے اور بصرہ کے مفتی بھی تھے۔ قتادہ کا بیان ہے "میں جس کسی فقیہ کے پاس بیٹھا میں نے دیکھا کہ وہ بھی حضرت حسن کے فضل و کرم کا مرہونِ منت ہی" ایوب کہتے تھے "میں نے حسن سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا"

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۴ و ۲۶۵ [3] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص تذکرہ حسن بصری۔

بکر المزنی کہتے ہیں "جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے عالم کو دیکھے اُس کو چاہئے کہ حسن کو دیکھے، کیونکہ ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو اُن سے بڑا عالم ہو۔" حماد بن سلمۃ، یونس بن عبید اور حمید الطویل سے نقل کرتے ہیں کہ ہم نے فقہا کو دیکھا لیکن حسن سے زیادہ کسی کو مروت میں کامل نہیں پایا۔"

وسعت علم وحکمت ان علوم وفنون نے اُن کو فضل وکمال اور حکمت وادب کا دریائے بے کنار بنا دیا تھا۔ ربیع بن انس سے منقول ہے، کہتے تھے۔

اختلفت الی الحسن عشر سنین	میں حضرت حسن کے پاس دس برس یا اس سے
او ما شاء اللّٰہ فلیس من یوم الّا	کم و بیش آتا جاتا رہا لیکن مجھ کو کوئی دن ایسا نہیں ملا
اسمع منہ مالم اسمع قبل ذالک	جس میں میں نے ایسی بات سُنی ہو جو میں اس سے پہلے سُن

چکا ہوں۔

اعمش کہتے ہیں "حسن حکمت کی باتیں خوب یاد کرتے تھے۔ پھر وہ اُن کا اظہار کر ڈالتے تھے۔ حضرت ابو جعفر باقر کے سامنے جب کبھی حسن کا ذکر آتا تھا تو وہ فرماتے تھے۔ ذالک الذی یشبہ کلامہ کلام الانبیاء" یہ تو وہ ہیں جن کا کلام انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔[1]

فصاحت وبلاغت گفتار، علمی مہارت وکمال کے علاوہ قدرت نے اُن کو فصاحت وبلاغت کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس وصف میں وہ سب سے ممتاز تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں "حضرت حسن بصرہ کے سب سے زیادہ فصیح وبلیغ تھے۔ علامہ ابن سعد اور حافظ ذہبی دونوں اُن کی فصاحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عون کہتے ہیں "میں حضرت حسن کے لہجہ کو رؤبتہ بن العجاج کے لہجہ سے تشبیہ دیتا ہوں[2]" ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں "میں نے حجاج اور حسن سے زیادہ فصیح اور رؤبتہ اور عجاج سے بڑا شاعر کوئی نہیں دیکھا[3]"

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک مسلمان کے لئے سب سے زیادہ کٹھن اور دشوار مرحلہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے۔ قدرت نے حضرت حسن کو جس بیدار قوتِ عمل کی دولت سے نوازا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۵ [2] ایضاً ص ۲۷۰ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۶

تھا اُس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے اربابِ صولت وہیبت کی پروانہ کرتے تھے اور جو امرِ حق ہوتا تھا اُس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اُنہیں لکھا کہ "مجھ پر خلافت کا بار ڈال دیا گیا ہے، آپ ایسے لوگ تلاش کیجئے جو اس معاملہ میں میری امداد کریں" حضرت حسن نے جواب دیا "لوگ دو ہی قسم کے ہیں، ابناءِ دنیا، تو آپ کو اُن کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ابناءِ آخرت، تو وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے۔ پس بہتر یہی ہے کہ آپ خدا سے مدد طلب کریں۔ ابن ہبیرہ کو یزید بن عبد الملک نے عراق و خراسان کی گورنری پر مامور کیا تو اُس نے حضرت حسن، ابن سیرین اور شعبی کو بلا کر کہا کہ خلیفہ نے مجھ کو فلاں معاملہ کی نسبت ایسا ایسا لکھا ہے اور میرا فرض ہے کہ اُس کے مطابق عمل کروں۔ اس پر ابن سیرین اور شعبی نے ایک ایسی بات کہی جس میں کچھ توریہ پایا جاتا تھا۔ پھر حسن بصری کی باری آئی تو اُنہوں نے صاف صاف کہا "ابوہبیرہ! تو یزید کے معاملہ میں اللہ سے خوف کر، اور اس کے برعکس اللہ کے معاملہ میں یزید سے مت ڈر کیونکہ اللہ زیادہ طاقتور ہے وہ تجھ کو یزید کے شر سے بچا سکتا ہے، لیکن یزید تجھ کو اللہ کے قہر سے نہیں بچا سکتا۔ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ تیرے پاس ایک فرشتہ بھیج دے جو تجھ کو تیرے تخت سے اُتار دے اور تیرے وسیع محل میں سے نکال کر تنگنائے قبر میں پہنچا دے اُس وقت سوائے تیرے عمل کے کوئی چیز تیرے کام نہیں آئے گی، تو خدا کی معصیت کرنے سے بچ، کیونکہ اللہ نے اس حکومت کو بندگانِ خدا اور دین کا مددگار بنایا ہے تو اُس کو دین اور بندگانِ خدا کے خلاف استعمال مت کر، کیونکہ خدا کی معصیت میں کسی بندہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ناجائز اور حرام ہے"[1]

ابوبکر الہذلی کہتے ہیں "حضرت حسنؒ نے کوئی درہم کسی تجارت میں نہیں لگایا کبھی کوئی عہدۂ سرکاری حاصل نہیں کیا اور وہ جس کسی چیز کا امر کرتے تھے پہلے اُسے

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۷۔

خود کرتے تھے۔ اسی طرح کسی چیز کے ترک کا حکم کرتے تو پہلے اُسے خود ترک کر دیتے تھے[۱]

علم باطن | حضرت حسنؒ علومِ ظاہریہ کے علاوہ علمِ باطن کے زیور سے بھی آراستہ تھے چنانچہ تمام بڑے بڑے اربابِ تصوف نے آپ کا نام جلی عنوان سے لکھا ہے اور سب کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ سلسلۂ تصوف کے شیخ الشیوخ ہیں۔

خوفِ خدا | تصوف میں اصل احسان یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حضور کا تصور ہر وقت رہے۔ حضرت حسن بصریؒ پر یہ کیفیت بہت غالب تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان سے ہر وقت خائف اور ترساں رہتے تھے۔ یونس بن عبید سے کسی نے دریافت کیا "آپ کوئی ایسا شخص بھی جانتے ہیں جو حسن کی طرح عمل کرتا ہو" کہنے لگے "عمل کرنا تو بہت دشوار ہے میں نے تو کوئی ایسا شخص بھی نہیں دیکھا جو اُن کے قول کی طرح اقوال کہتا ہی ہو" اس کے بعد انہوں نے حضرت حسن کی توصیف کرتے ہوئے بیان کیا "وہ جب آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی دوست کو دفن کر کے آرہے ہیں، اور جب بیٹھتے تھے تو اس قدر اُداس ہوتے تھے کہ گویا وہ ایک قیدی ہیں جس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے، اور جب اُن کے سامنے دوزخ کا ذکر کیا جاتا تو اُن پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی تھی کہ گویا دوزخ اُن کے سوا کسی اور کے لئے پیدا ہی نہیں کی گئی"[۲]

وفات | ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ وفات سے چند روز قبل ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک پرندہ نے مسجد کی ایک کنگری اُٹھالی اُس نے حضرت ابن سیرین سے تعبیر پوچھی تو اُنہوں نے کہا "اگر تمہارا یہ خواب سچ ہے تو حسن بصری کا انتقال ہو جائیگا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد حسن بصری وفات پا گئے، جنازہ اُٹھا تو اُس میں اس کثرت سے لوگ شریک تھے کہ جامع بصرہ میں عصر کی نماز کے لئے ایک متنفس بھی نہیں تھا۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں "آغازِ اسلام سے اب تک کی تاریخِ بصرہ میں یہ سب سے پہلا اتفاق تھا"[۳]

[۱] شذرات الذہب، ج ۱ ص ۱۳۰ [۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۸ [۳] ایضاً

محمد بن سیرینؒ

نام ونسب محمد نام، ابوبکر کنیت، والد کا نام سیرین تھا جو جرجرایا (عراق) کے باشندے تھے اور عین التمر میں ٹھٹھیرے کا کام کرتے تھے، اسی عین التمر کے معرکہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور کسی کو تقسیم کردیے گئے۔ بعد میں وہ انس بن مالکؓ کی غلامی میں آگئے تھے جنہوں نے بیس ہزار درہم پر مکاتبت کرکے انہیں آزاد کردیا[1]۔

ابن سیرین کی والدہ صفیہ حضرت ابوبکرؓ کی باندی تھیں، لیکن وہ اس شان کی تھیں کہ جب اُن کے نکاح کا وقت آیا تو تین ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اُن کی مشاطگی کا کام انجام دیا اور اٹھارہ بدری صحابہ کرام جن میں ابی بن کعب بھی تھے نکاح کی تقریب میں شامل ہوئے، آراستگی کے بعد امہات المومنین نے حضرت صفیہ کے لئے دعا مانگی اُدھر مردانہ مجلس میں حضرت اُبیؓ دعا مانگتے جاتے اور دوسرے صحابہ آمین کہتے جاتے تھے[2]۔

ولادت سیرین کثیر الاولاد تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ صرف اُمہات الاولاد کے بطن سے ان کے تیس ۳۰ لڑکے تھے لیکن محمد حضرت صفیہ کے بطن سے تھے۔ ۳۳ھ میں جبکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے میں دو سال باقی تھے آپ پیدا ہوئے[3]۔

علم وفضل محمد بن سیرین فارس میں مدت تک حضرت انس بن مالک کے ساتھ کاتب کی حیثیت سے رہے تھے اور اس تقریب سے اُن کو حضرت انس سے علمی استفادہ کا بہت کافی موقع ملا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ ایسے جلیل القدر صحابہ کے فیضِ صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کی توجہ اور خود ابن سیرین کے ذاتی شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم کے پیکر ہوگئے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:۔

۱؎ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۳ ۲؎ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۸ ۳؎ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۳

وکان فقیھاً اماماً عزیر العلم ثقۃ ثبتاً علامۃً فی التعبیر راساً فی الورع۔[1]	ابن سیرین فقیہ، امام، وافر العلم، معتمد، ثابت فی الحدیث، تعبیر میں علامہ، زہد و تقویٰ کے امام تھے۔

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "ابن سیرین ثقہ، مامون بلند مرتبہ، عالی شان فقیہ اور امام کثیر العلم اور متقی تھے[2]

تفسیر وہ تمام اسلامی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے چنانچہ وہ تفسیر کے بھی امام تھے۔ علامہ نووی انہیں "الامام فی التفسیر والحدیث والفقہ وعبر الرؤیا والمقدم فی الزھد والورع" لکھتے ہیں[3]

حدیث جیساکہ معلوم ہو چکا ہے ابن سیرین حضرت انس بن مالک سے خاص تربیت یافتہ اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمر و ابن عباسؓ کے فیض صحبت پائے ہوئے تھے اور ان بزرگوں کے علاوہ انہوں نے دوسرے اجلہ صحابہ سے حدیث کی روایت کی ہے جن میں سے بعض کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔ زید بن ثابت، حذیفہ بن یمان، حسن بن علی رافع بن خدیج، سلیمان بن عامر، سمرۃ بن جندب، ابوالدرداء، معاویہ، ابوسعید خدری رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ صحابہ کے علاوہ جن غیر صحابہ علماء حدیث سے انہوں نے روایت کی ہے اُن میں مشہور یہ ہیں:۔ عکرمہ، شریح، عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ، قیس بن عباد، مسلم بن یسار وغیرہ[4]۔ ان اکابر اُمت کے فیض نے ابن سیرین کو علم حدیث کا امام بنا دیا تھا۔

ثقاہت ثقاہت میں اُن کا پایہ اتنا بلند تھا کہ ہشام بن حسان نے محمد بن سیرین سے ایک روایت نقل کی تو کہا "مجھ سے یہ روایت اُس شخص نے بیان کی ہے جو اُن تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سچا ہے، جن کو میں نے پایا ہے" ابن مدینی کہتے تھے دو حضرت ابوہریرہؓ کے اصل شاگرد چھ ہیں۔ ابن المسیب، ابوسلمہ، الاعرج، ابوصالح، ابن سیرین، طاؤس، امام

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳۔ [2] ابن سعد ج ۷، ص: ۱۴۳ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۲ [4] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵-۲۱۶

احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عون کا مقولہ ہے "میں نے دنیا میں تین ایسے آدمی نہیں دیکھے، عراق میں محمد بن سیرین، حجاز میں قاسم بن محمد، شام میں رجاء بن حیوۃ۔ اور ان تینوں میں محمد بن سیرین جیسا کوئی نہیں تھا"[1]۔ امام شعبی تلامذہ کو ہدایت کرتے تھے کہ ابن سیرین کے خوانِ علم سے فائدہ اٹھائیں[2]۔ علی بن مدینی، عمرو بن علی وغیرہما کہتے تھے اصح الاسانید "محمد بن سیرین عن عبیدۃ عن علی" ہے[3]۔

احتیاط | اس وسعتِ علم اور ثقاہت کے باوجود روایت کرنے میں نہایت احتیاط کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ روایت کے صرف معانی نقل کر دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بالفاظہا روایت کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ابن عون کہتے ہیں کان ابن سیرین یحدث بالحدیث علی حروفہ[4] اس احتیاط کی وجہ سے معمولی مرتبہ کے لوگوں سے علم اور حدیث کا اخذ کرنا نامناسب سمجھتے تھے، چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے "علم دین ہے۔ اس کو حاصل کرنے سے قبل اس شخص کو خوب اچھی طرح پرکھ لو جس سے اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو"[5]۔

فقہ | فقہ میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ علامہ ابن سعد، حافظ ذہبی۔ امام نووی، حافظ ابن حجر انہیں فقیہ تسلیم کرتے ہیں۔ مورق العجلی کہتے ہیں "میں نے ابن سیرین سے زیادہ کوئی پاکباز فقیہ نہیں دیکھا"[6]۔ ابن حبان انہیں فقیہ فاضل بتاتے ہیں[7]۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں

"وکان محمدٌ احد الفقہاء من اھل بصرۃ والمذکورین بالورع فی وقتہ"[8]۔

لیکن احتیاط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جن اُمور میں ذرا سا شبہ بھی ہوتا تھا اُس کے متعلق فتویٰ نہیں دیتے تھے[9]۔ کوئی شخص اُن سے فقہ کا مسئلہ پوچھتا تو اُن کا رنگ یکایک متغیر ہو جاتا اور حالت دگرگوں ہو جاتی تھی[10]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵-۲۱۶ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴ [4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۳
[5] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۱۴۱ [6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳ [7] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۶
[8] تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۱ [9] ایضاً ج ۵ ص ۳۳۶ [10] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۱۴۲

قضا میں مہارت | فقہی کمال کی وجہ سے اُن کو قضا میں بڑی مہارت تھی۔ عثمان البتی کا قول ہے "اس نواح میں محمد بن سیرین سے بڑا کوئی ماہر قضا نہیں ہے[1]" لیکن اس کے باوجود عہدۂ قضا سے گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو شام بھاگ گئے اور وہاں سے مدینہ پہنچ گئے[2]

زہد و ورع | ان علمی کمالات کے ساتھ اُن میں زہد و ورع بھی حد سے زیادہ تھا۔ ابن سیرین کسب معاش کے لئے تجارت کرتے تھے۔ لیکن انہیں اس میں کچھ شک ہو گیا تو اُسے بھی چھوڑ دیا۔ اتقاء کا یہ عالم تھا کہ وہ خود فرماتے ہیں "خواب میں اور بیداری میں میں ام عبداللہ یعنی اپنی بیوی کے سوا کسی عورت کے پاس نہیں آیا" پھر فرماتے ہیں "خواب میں اگر کوئی اجنبی عورت دیکھتا ہوں تو فوراً خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عورت میرے لئے حلال نہیں ہے اس خیال کے آتے ہی میں فوراً اپنی نگاہ پھیر لیتا ہوں[3]"

مالی نقصان | غایتِ احتیاط کے باعث انہیں بعض اوقات شدید مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے لیکن وہ اُس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ (غالباً تجارت کی سلسلہ میں) انھوں نے زیتون کے تیل کی ایک مشک چالیس ہزار درہم میں خریدی اُس میں اتفاق سے ایک مرا ہوا چوہا نکل آیا۔ حضرت ابن سیرین نے اس خیال سے کہ ممکن ہے چوہا کولہو میں پڑا ہوا ہو پوری مشک پھنکوا دی۔ لیکن چونکہ اُسے خرید چکے تھے اس لئے تیل والے نے قیمت کا مطالبہ کیا یہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں قید کر دیا گیا[4]۔

خیانت سے احتراز | جیل کا انچارج ان کا ارادتمند تھا، اُس نے کہا "میں رات کے وقت جیلخانہ آپ کے لئے کھول دیا کرونگا، آپ اُس وقت اپنے بال بچوں کے پاس چلے جایا کیجئے" لیکن آپ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ "میں تمہاری خیانتِ فرضِ منصبی میں اعانت نہیں کرونگا[5]"

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۹ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۶

[4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴ - [5] ایضاً

خوفِ خدا | اس زہد و اتقاء کا سبب یہ تھا کہ ان میں خوفِ خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ہشام بن حسان کہتے ہیں "ہم ایک مرتبہ ابن سیرین کی معیت میں ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں ہم نے اُن کو دیکھا کہ دن کو ہنستے اور رات کو روتے تھے" ابن عون کہتے ہیں "ابن سیرین امت کے متعلق تو بہت پر اُمید لیکن خود اپنی ذات کی نسبت بہت شدید اور سخت تھے"[1]

ابو قلابہ کہتے ہیں "محمد بن سیرین کی طرح کون نیزہ کی دھار پر سوار ہونے کی طاقت رکھتا ہے" اُن کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تھا تو اُس سے بھی آخرت کے ڈر سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ گویا اُن کے ایک ایک عضو پر موت طاری ہو گئی ہے"[2]

شانِ بزرگی | مجموعی طور پر وہ خصائلِ حمیدہ کے ایسے جامع تھے کہ اُن کو کسی پہلو سے دیکھا جاتا اُن کی خوبیاں آشکارا ہو جاتی تھیں۔ ابو قلابہ کہتے ہیں۔

اصرفوہ حیث شئتم فلتجدنہ — تم اُن کو جس طرح چاہو آزما کر دیکھو تم دیکھو گے

اشدکم ورعاً واملککم لنفسہ[3] — کہ وہ تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور تم سب سے زیادہ ضابطِ نفس ہوں گے۔

خلفاء کا اعزاز | حضرت محمد بن سیرین کی جلالتِ شان کی وجہ سے اعیان و امراء ان کے پاس ہدایا بھیجتے تھے، لیکن اُن کے استغناء کا یہ عالم تھا کہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز جیسے بزرگ شمائل خلیفہ نے اُن کے اور حضرت حسن بصری کے پاس کچھ ہدایا روانہ کئے تو حسن بصری نے انہیں قبول کر لیا، لیکن محمد بن سیرین نے انہیں واپس کر دیا[4]

شانِ بزرگی | حدیث میں اہل اللہ کی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ انہیں دیکھتے ہی خدا یاد آ جائے حضرت محمد بن سیرین کا حال یہی تھا۔ ابو عوانہ کہتے ہیں "میں نے ابن سیرین کو دیکھا ہے کہ بازار سے جب گذرتے تھے تو لوگ اُن کے صلاح و تقویٰ کی وجہ سے اللہ کا ذکر کرنے

---

[1] دیکھو تہذیب الاسماء اور تاریخ بغدادی [2] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۷۳، [3] تہذیب الاسماء ج ا ص ۸۴ [4] ابن سعد ج ۷ ق ا ص ۱۴۲

لگتے، اور اُس کے نام کی تسبیح و تہلیل پڑھنے لگتے تھے۔[1] ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں "ابن سیرین کسی مکان میں تشریف لے جاتے تو وہاں کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا تھا جو اُن کو دیکھ کر اللہ کا ذکر شروع نہ کر دیتا ہو۔[2] ابن قتیبہ کہتے ہیں۔ "ابن سیرین علم اور عبادت میں مرتبۂ کمال رکھتے تھے۔[3]

تعبیر خواب | ابن سیرین بہترین معبرِ خواب کی حیثیت سے عوام و خواص میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اُن کے متعلق بعض دلچسپ حکایتیں بھی مشہور ہیں۔ ان کی وفات سے چند روز قبل ایک شخص آیا اور کہنے لگا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک نامعروف فربہ پرندہ اُترا اور ایک درخت پر بیٹھ کر پھول چُننے لگا پھر وہ اُڑ گیا" ابن سیرین کے چہرہ کا رنگ یہ سنتے ہی متغیر ہوگیا اور فرمایا "یہ علماء کی موت ہے"۔ اس فن میں کمال کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے درخواست کی کہ مجھ کو خواب کی تعبیر سکھا دیجئے، اُنہوں نے فرمایا "اپنا منہ کھولو" میں نے تعمیلِ ارشاد میں مُنہ کھولا تو آپ نے اُس میں اپنا لعابِ دہن ڈال دیا، اس واقعہ کے بعد سے میں خواب کی تعبیریں بیان کرنے لگا"۔[4]

شادی | آپ نے ایک عربی خاتون سے شادی کی تھی جس سے آپ کے اولادِ کثیر ہوئی لیکن عبداللہ بن محمد کے سوا سب کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔[5]

وفات | حضرت حسن بصری کی وفات کے سو تین ماہ بعد شوال سنہ ۱۱۰ھ میں ستر برس کی عمر پاکر انتقال کیا۔[6]

---

[1] خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۷ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۹ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۹

[5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۸ [6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۷۔

ابوالعالیۃ الریاحی

نام ونسب رفیع نام، ابوالعالیہ کنیت تھی بنوالریاح کی ایک عورت کے غلام تھے جس نے ان کو بعد میں آزاد کر دیا تھا، اُس کی نسبت سے ریاحی کہلاتے ہیں[1]۔ ان کے والد کا نام مہران تھا۔ بصرہ کے باشندہ تھے[2]۔

آزادی اپنی آزادی کی داستان وہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں "مجھ کو ایک عورت نے خریدا اور جب اُس نے آزاد کرنا چاہا تو اُس کے چچازاد بھائیوں نے کہا کہ تم اس کو آزاد کردو گی تو یہ کوفہ چلا جائیگا، اور ہم سے تعلق بالکل منقطع ہوجائیگا۔ اس کے بعد وہ عورت مجھ کو مسجد کے ایک حصہ میں لائی اور مجھے اس کی خدمت کے لئے آزاد کر دیا اور دعا مانگی کہ خدایا اللہ میں ابوالعالیہ کو اس لیے آزاد کر رہی ہوں کہ قیامت کے دن میرا یہ کارِ ثواب میرے لئے ایک ذخیرۂ آخرت بن جائے۔"

اسلام حضرت ابوالعالیہ مخضرمی تھے یعنی انہوں نے عہدِ جاہلیت بھی پایا تھا اور عہدِ اسلام بھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۲ دو سال بعد مشرف باسلام ہوئے اس لئے صحابی نہ ہوسکے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُنہوں نے قرآن مجید پڑھا، اور اس شوق و رغبت سے کہ ایک رات میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کو آزادی نہیں ملی تھی۔ دن بھر اپنے آقا کا کام کرتے، اور رات کو قرآن مجید کی اوّل سے آخر تک تلاوت کرتے تھے۔ یہ محنتِ شاقہ برداشت نہ ہوسکی تو ۲ دو راتوں میں ایک قرآن مجید کے ختم کرنے کا اہتمام کیا۔ لیکن یہ بھی برداشت نہ ہوسکا تو تین راتوں میں ایک قرآن مجید ختم کرنے لگے۔ جب یہ بھی ناقابلِ تحمل ثابت ہوا تو اُنہوں نے بعض صحابۂ کرام سے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ق اص ۸۱ ۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱

شکایت کی اُنہوں نے بتایا کہ جمعہ جمعہ یا ہفتہ میں کوئی اور دن، بہر حال سات دن میں ایک قرآن مجید ختم کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ابو العالیہ کہتے ہیں[1] اس مشورہ سے ہم کو عشاء کی نماز کے بعد سونے کا موقع ملجاتا تھا اور ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرنا گراں نہیں گذرتا تھا۔[2]

تحصیل علم | حضرت ابو العالیہ کو تحصیلِ علم کا اتنا شوق تھا کہ غلامی کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود اُنہوں نے قرآن مجید پڑھا اور اُس کے ساتھ عربی کتابت بھی سیکھی۔ پھر حدیث کا شوق پیدا ہوا تو بصرہ کے علماء سے سماع حدیث کرتے رہے اس سے تشنگی فرو نہ ہوئی تو اُنہوں نے مدینہ طیبہ کا ارادہ کیا تاکہ یہاں صحابۂ کرام سے بلا واسطہ استفادہ کر سکیں۔[3]

فضل وکمال | اُن کی اس کوشش اور طلبِ صادق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہد کے نامور علماء تفسیر و حدیث و فقہ میں شمار ہونے لگے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "کان ثقۃ کثیر الحدیث"[4] یحییٰ بن معین، ابو زرعہ، ابو حاتم اور دوسرے ائمہ کرام بھی انہیں "ثقہ" مانتے ہیں۔[5] ابو القاسم الطبری کہتے ہیں "وہ ثقہ ہیں اور ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے"۔[6]

تفسیر | قرآن مجید کے ساتھ اُن کو خاص شغف تھا اور اس میں اُنہوں نے خاص بصیرت پیدا کی تھی، یہاں تک کہ ابو بکر بن ابی داؤد فرمایا کرتے تھے کہ "صحابہ کے بعد ابو العالیہ سے بڑھ کر کوئی عالم بالقرآن نہیں۔ سعید بن المسیب بھی ان کے بعد ہیں"۔[7]

قرأت | تفسیر کے ساتھ قرأت کے فن سے بھی واقف تھے اور اس کی تعلیم اُنہوں نے باقاعدہ حضرت ابی بن کعب سے حاصل کی تھی۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی دونوں انہیں "المقری" لکھتے ہیں۔[8]

حدیث | تفسیر و قرأت کے ساتھ اُنہیں حدیث میں بھی کمال حاصل تھا۔ پہلے گذر چکا ہے

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۱ [2] ایضاً ص ۸۲ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۵ [4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱
[5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱ [6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۸ [7] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۸ و
شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۲

اسی شوق میں یہ بصرہ سے سفر کر کے مدینہ طیبہ آئے تھے، یہاں اجلۂ صحابہ موجود تھے
ان سے انہوں نے حدیث کا سماع کیا۔ ان میں سے بعض نام یہ ہیں: حضرت عمر بن
الخطابؓ۔ ابن مسعودؓ۔ علیؓ اور حضرت عائشہؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ ابوایوبؓ۔ ابوموسیٰؓ۔ ابن
عباسؓ۔ ابو برزہؓ۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوالعالیہ سے روایات نقل کی
ہیں[1]۔ اُن کے اس فضل و کمال کی وجہ سے حضرت ابن عباس جو خود بہت بڑے مفسر و
محدث اور فقیہ و امام تھے حضرت ابوالعالیہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ حضرت
ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے، ابوالعالیہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے اپنا ہاتھ حضرت
ابوالعالیہ کے ہاتھ میں دے کر اُنہیں تخت ہی پر اپنے پاس بٹھالیا۔ بنو تمیم کا ایک شخص بولا
"یہ تو غلام ہیں" آپ نے فرمایا "علم اسی طرح شرفا میں شرف بڑھاتا ہے اور غلاموں کو
تخت پر بٹھاتا ہے[2]"

فتنہ سے احتراز | ان علمی کمالات کے علاوہ اُن میں عملی و اخلاقی کمالات بھی کچھ کم نہ تھے طبیعت
نہایت سلیم پائی تھی۔ فتنہ و فساد سے طبعاً اجتناب کرتے تھے۔ اپنا ایک واقعہ وہ خود
بیان کرتے ہیں کہ "جس وقت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہو رہی تھی میں
اُس زمانہ میں جوان تھا لڑنا مرنا مجھ کو عمدہ عمدہ کھانوں سے بھی زیادہ مرغوب تھا۔ چنانچہ
میں نے بھی جنگ میں جانے کا ارادہ کیا، اور اس کے لئے خوب تیاریاں کیں میدانِ
کارزار میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دونوں صفیں آراستہ ہیں اور اس قدر بڑی ہیں کہ اُن کے
کنارے نظر ہی نہیں آتے اُن میں سے ایک فریق نعرۂ تکبیر بلند کرتا تھا، تو فریق ثانی بھی اللہ اکبر
پکارتا تھا۔ اب میں نے دل میں سوچا کہ میں ان میں سے کس فریق کو کافر قرار دوں اور کس کو
مومن سمجھتا ہوں۔ پھر میں نے خیال کیا کہ مجھ کو یہاں جنگ میں آنے پر کس نے مجبور کیا ہے؟ جواب
کسی نے بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے میں میدانِ جنگ سے واپس چلا آیا[3]"

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۲ [3] ایضاً

بے تکلفی دوستوں کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے رہتے تھے۔ شعیب بن الحجاب بیان کرتے ہیں "ابو العالیہ ہمارے گھر آتے تھے، اور فرماتے "تمہارے گھر میں جو کچھ کھانا تیار ہو ہمیں لاکر کھلا دو، بازار سے ہرگز کوئی چیز مت خریدنا"[1]

بدگمانی سے اجتناب بدگمانی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ابو خلدہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ابو العالیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اُن کا ایک غلام ایک رومال لیکر آیا جس میں سربمہر شکر کے ٹکڑے تھے۔ ابو العالیہ نے مہر توڑ کر دس دانے خود غلام کو دیدیے، اور پھر فرمایا "اگر یہ غلام خیانت کرتا بھی تو اس سے زیادہ کی خیانت نہ کرتا اور یوں ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ نوکر یا غلام سے کوئی چیز منگائیں تو سربمہر منگائیں، تاکہ بدگمانی کا موقع ہی نہ رہے"[2]

بے ریائی انہیں ایسے لباس یا ایسی وضع و قطع سے قلبی نفرت تھی جس سے ریاکاری کی بو آتی ہو۔ ایک دفعہ عبد الکریم اُن کے پاس اونی کپڑے پہنے ہوئے آئے۔ حضرت ابو العالیہ نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا "یہ تمہارا لباس تو راہبوں کا سا لباس ہے۔ مسلمان جب ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے جاتے ہیں تو عمدہ کپڑے پہنتے ہیں"

لباس میں نفاست چنانچہ حضرت ابو العالیہ کا معمول ہی یہ تھا کہ گھر میں سادہ لباس رکھتے اور پاجامہ پہنتے تھے۔ کسی نے اُن سے پوچھا "آپ گھر میں پاجامہ کیوں پہنتے ہیں"؟ فرمایا۔ "اس سے ستر خوب ہوتا ہے اور گھر میں مردوں کو پاجامہ ہی پہننا چاہیے" لیکن جب وہ کہیں باہر جاتے تھے تو عمدہ سے عمدہ کپڑے جن میں قمیص، چادر، اور ازار شامل ہوتے تھے، زیب تن فرماتے تھے۔ لیکن ان تمام کپڑوں میں چادر کا زیادہ اہتمام کرتے تھے، خود اُن کا بیان ہے کہ "میں چادر زیادہ اچھی اوڑھتا ہوں جس کی قیمت بیس اور تیس درہم ہوتی ہے"

اہل بیت سے محبت اہل بیت سے اُن کو دلی محبت تھی۔ اُن کا یہ معمول تھا کہ اپنے مال کی

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۳۔ [2] ایضاً۔

پوری زکوٰۃ مدینہ منورہ بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں اہل بیت کو دیدی جائے اور وہ اپنی صوابدید سے جس مستحق کو جتنا دینا چاہیں دے سکیں۔ جب اُن کا انتقال ہونے لگا تو اُنہوں نے وصیت کی کہ "میں جتنا سونا، چاندی یا مال بطور ترکہ چھوڑے جا رہا ہوں اُس کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ ایک حصّہ فی سبیل اللہ خرچ کیا جائے، ایک فقراء مسلمین کو دیا جائے، اور ایک تہائی اہل بیت اطہار کی خدمت میں میری طرف سے بطور نذرانہ پیش کر دیا جائے۔" ساتھ ہی وصیت کی کہ "میری بیوی کا حق بھی ادا کرنا۔"

نکاح ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص اپنی کسی باندی کو تعلیم و تربیت دے اور پھر اُسے آزاد کر کے اُس سے نکاح کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کو دوہرا اجر دیتا ہے۔ حضرت ابو العالیہ نے اسی پر عمل کرتے ہوئے اپنی ایک جاریہ کو آزاد کر کے اُس سے نکاح کر لیا تھا۔ اور آپ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، انتقال ہونے لگا تو ورثاء کو خاص طور پر وصیت کی کہ میری بیوی کا حق پورا پورا دے دیا جائے۔ عید الفطر کے موقع پر اپنی طرف سے ایک قفیز اور اپنی بیوی کی طرف سے دو مکوک یعنی ایک سیر کے قریب صدقہ ادا کرتے تھے۔[1]

جمال ان معنوی کمالات کے ساتھ قدرت نے کمالِ صوری سے بھی حصّہ وافر عطا فرمایا تھا۔ اصمعی کا بیان ہے کہ ابو العالیہ اور مکحول ازدی دونوں جمیل ہیں، اور حضرت ابو العالیہ ظریف الطبع بھی بہت تھے۔[2]

وفات علامہ ابن سعد نے تاریخِ وفات ۹۰ھ بتائی ہے۔ لیکن حافظ ذہبی اور ابن عماد الحنبلی دونوں لکھتے ہیں کہ صحیح ۹۳ھ ہے۔ مرض کے دنوں میں نہایت نقیہ ہو گئے تھے۔ بچھونے سے اُتر نہیں سکتے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے اور سجدہ تکیہ پر کرتے تھے۔[3] خراسان کے کسی علاقہ میں انتقال ہوا۔

---

[1] یہ سب واقعات ابن سعد ج ۷ ق ۱ تذکرہ ابو العالیہ سے ماخوذ ہیں [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۲ [3] ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۸۲

عطاء بن یسار

نام و نسب ابو محمد کنیت، عطاء نام، والد کا نام یسار تھا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی غلامی کا شرف رکھتے تھے۔ مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور عبد الملک کے بھائی تھے۔[1]

ولادت ۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔[2]

علم و فضل حضرت میمونہؓ کے شرفِ صحبت اور اس تقریب سے دوسرے اکابر اُمت کی مجالست نے اُن کو حدیث کا معتمد عالم بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں وکان ثقۃً کثیر الحدیث۔[3] حافظ ذہبی انہیں الامام الربانی اور الفقیہ الواعظ بتاتے ہیں اور پھر تحریر کرتے ہیں "عطاء بڑے ثقہ اور علم کا ظرف تھے"۔[4]

شیوخ اُنہوں نے صحابۂ کرام کی ایک جماعتِ کثیرہ سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ جن میں زیادہ مشہور نام یہ ہیں۔ حضرت ابوذرؓ، ابو الدرداءؓ، عبادہ بن الصامتؓ، زید بن ثابتؓ، معاویہ بن الحکم السلمیؓ، ابو ایوبؓ، ابو قتادہؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابو رافعؓ مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اُم المومنین حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا، امام بخاری اور ابن سعد کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، ان بزرگوں سے فیض پانے کے علاوہ علم کی جستجو میں اُنہوں نے شام اور مصر کا بھی سفر کیا تھا۔[5] حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ عطاء بن یسار واعظ، عبادت گذار اور صاحبِ فضل و کمال تھے۔[6] امام نووی لکھتے ہیں "ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔"

تلامذہ ان سے جن بزرگوں نے سماع حدیث کا فیض پایا اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۱۸ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴

[5] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۱۸ [6] ایضاً

ابو مسلمہ بن عبد الرحمٰن، محمد بن عمر بن عطاء، محمد بن عمرو بن حلحلہ، ہلال بن علی، زید بن سلم شریک بن ابی نمر، محمد بن ابی حرملہ، عمرو بن دینار۔

فقہ حدیث کے بڑے عالم ہونے کے ساتھ وہ فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے چنانچہ حافظ ذہبی اور ابنِ عماد حنبلی نے انہیں "الفقیہ" لکھا ہے۔

قضاء ابن عماد الحنبلی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مدینہ میں ایک سال تک قضا کی خدمت بھی انجام دیتے رہے تھے۔ ابن قتیبہ بھی یہی لکھتے ہیں[۱]۔

خودداری حضرت عطاء بن یسار اگرچہ غلام تھے لیکن حضرت میمونہ کی معیت و مصاحبت اور علم و فضل نے اُن میں خودداری کا ایسا جوہر پیدا کر دیا تھا کہ ایک مرتبہ کسی عرب نے اُن کی صاحبزادی سے نکاح کرنا چاہا تو آپ نے جواب میں کہا "ہم تمہارے نسب میں اور تمہارے مرتبہ و مقام میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتے لیکن شادی بیاہ کے معاملات ہم اپنے جیسے لوگوں میں ہی کرتے ہیں اور تم بھی شادی اپنے قبیلہ میں ہی کرتے ہو[۲]۔"

وفات واقدی کی روایت تو یہ ہے کہ عطاء بن یسار کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں ہوئی لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۹۴ھ میں اسکندریہ میں وفات پائی۔ علامہ نووی اس روایت کو "اصح" اور علامہ ابن سعد اس کو "اشبہ" یعنی زیادہ قابلِ قبول فرماتے ہیں[۳]۔

۱۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵ [۲] ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۹ [۳] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۳۶، ابن سعد ۵۶۔ ص ۱۲۴

ابوبکر بن عیاش

نام ونسب۔ ان کے نام میں متعدد اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ شعبہ نام تھا، ابوبکر کنیت۔ واصل الاحدب الاسدی کے غلام تھے۔ کوفہ وطن تھا، ۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔

علم وفضل۔ مشہور امام قرأت حضرت عاصم سے تین مرتبہ قرآن مجید پڑھا تھا۔ علم حدیث میں اُن کے مشہور اساتذہ یہ ہیں۔

ابواسحاق السبیعی۔ عبدالملک بن عمیر، صالح مولیٰ عمرو بن حریث، اسماعیل اسدی۔

تلامذہ۔ ان کے علم وثقاہت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابوداؤد الطیالسی، ابوکریب، ابن مبارک، اور ابن نمیر، ایسے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔ ابن مبارک کہتے تھے "میں نے کسی شخص کو حدیث کی طرف سبقت کرنے میں ابوبکر بن عیاش سے زیادہ تیز نہیں پایا" امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "ابوبکر ابن عیاش صاحب قرآن وخبر ہیں"

حدیث میں اُن کا پایہ۔ امام ابوداؤد انہیں ثقہ کہتے ہیں لیکن امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:۔ "ربما غلط" یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں "ابوبکر اپنے صلاح کامل کی وجہ سے معروف ومشہور ہیں" وہ صاحب فقہ تھے اور اخبار کا علم بھی رکھتے تھے لیکن اُن کی حدیثوں میں اضطراب پایا جاتا ہے علامہ ذہبی انہیں "شیخ الاسلام" لکھتے ہیں

زہد وورع۔ "علم کے ساتھ صاحب زہد وورع بھی تھے۔ یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ ابوبکر بڑے عالم وفاضل تھے، چالیس برس تک اُنہوں نے اپنا پہلو زمین سے نہیں لگایا"

مقولے۔ اُن کے بعض مقولے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے تھے۔ ابوہشام الرفاعی بیان

کرتے ہیں، ایک مرتبہ ابوبکر بن عیاش نے فرمایا:-

الخلق اربعۃٌ معذورٌ ومخبورٌ ومجبورٌ ومثبورٌ فالمعذور البھائم والمخبور بنو آدم والمجبور الملائکۃ والمثبور ابلیس۔

خلق چار قسم کی ہے۔ معذور، آزمودہ، مجبور و بے بس اور ہلاکت زدہ۔ معذور بہائم ہیں، آزمودہ انسان، مجبور اور بے بس فرشتے، اور ہلاکت زدہ شیاطین ہیں۔

خشیت ربانی کا ان پر غلبہ رہتا تھا، ایک مرتبہ فرمایا "دنیا میں آنا تو سہل ہے لیکن یہاں سے منتقل ہو کر اللہ کی طرف جانا بہت سخت ہے"۔

وفات | جمادی الاولیٰ ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت بہن پاس بیٹھی تھیں یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ آپ نے فرمایا "تم روتی کیوں ہو؟ اس گوشہ کو دیکھو یہاں میں نے اٹھارہ ہزار مرتبہ قرآن مجید ختم کیا ہے"۔[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۴-۲۴۵-

زید بن اسلم

نام و نسب ابو اسامہ کنیت، زید نام۔ والد کا نام اسلم تھا حضرت عمرؓ کے غلام تھے۔

علم و فضل زید کو اس محترم و مقدس ہستی کی غلامی کا شرف حاصل تھا جس کے فیضانِ صحبت نے بے مقدار ذروں کو چشمک زنِ آفتاب بنا دیا تھا۔ پھر زید تو غلامی کی وجہ سے ہر وقت ان کی صحبت و معیت سے شادکام ہوتے تھے، چنانچہ حضرت زید علم و عمل کا ایک پیکرِ لطیف بن گئے اور وہ مدینہ کے علماءِ اعلام و صلحاءِ کرام میں شمار ہونے لگے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام المدنی الفقیہ" لکھتے ہیں[1]۔ علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں "ومناقبہ کثیرۃ"[2]

تفسیر ان کو حضرت ابن عمر کے فیضانِ صحبت کے باعث تفسیر میں خاص درک تھا۔ یعقوب بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ "زید تفسیر قرآن کے عالم تھے"[3] عبید اللہ بن عمر کا ان کی نسبت ایک قول ہے کہ "زید قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بکثرت کرتے تھے" اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اس قول کے مطابق زید تفسیر القرآن بالرائے کی وعید کے ماتحت داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عبید اللہ بن عمر اسی مقولہ میں یہ بھی فرماتے ہیں "لا اعلم بہ باسًا" اور ممکن ہے کہ حضرت زید نے بعض آیات کی تفسیر ایسی روایات کی روشنی میں کی ہو جس سے حضرت عبید اللہ بن عمر بے خبر ہوں اور اس بنا پر انہوں نے زید کی تفسیر کو تفسیر بالرائے کہہ دیا ہو[4]۔

حدیث تفسیر کی طرح حدیث میں بھی ان کو یکساں کمال حاصل تھا۔ صحابہ میں انہوں نے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۰۰ [3] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶

[4] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶۔

حضرت عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ، اُم المومنین عائشہ صدیقہ، جابر، ربیعہ بن عباد، سلمہ بن اکوع اور انس بن مالک سے روایت کی ہے۔ تابعین میں اُن کو متعدد اکابر سے سماع کا شرف حاصل تھا۔

درس حدیث | خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے تھے۔ جس میں مدینہ طیبہ کے اکابر علماء و فقہاء شریک ہوتے تھے۔ ابو حازم کا بیان ہے کہ حضرت زید کی مجلس میں چالیس بڑے بڑے فقہاء شرکت کرتے تھے۔ جن کی باہمی الفت و مواسنت کی ایک ادنیٰ دلیل یہ تھی کہ ایک کا مال دوسرے کی خدمت و اعانت کے لئے ہمہ وقت موجود رہتا تھا اور اُن میں سے دو شخص کبھی آپس میں بے فائدہ لڑتے جھگڑتے اور نزاع و پیکار کرتے نہیں دیکھے گئے[1]۔

حضرت زید کے حلقۂ درس میں امام زین العابدین علی بن الحسین بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک دن نافع بن جبیر بن مطعم نے اُن سے کہا کہ آپ اپنے خاندانی حلقہ کو چھوڑ کر عمر بن الخطاب کے غلام کے حلقہ میں شریک ہوتے ہیں؟ فرمایا "انسان اُسی شخص کے پاس بیٹھتا ہے جس کی صحبت اُس کے دین کے لئے نافع ہوتی ہے[2]۔"

تلامذہ | جن لوگوں نے اُن کے دامنِ علم سے خوشہ چینی کی اُن کی فہرست بہت طویل ہے چند اسمائے گرامی یہ ہیں:۔ حضرت زید کے تین صاحبزادے، اُسامہ، عبداللہ اور عبدالرحمٰن، مالک بن عجلان، ابن جریج، سلیمان بن بلال، حفص بن میسرہ، داؤد ابن القیس الفراء، ایوب السختیانی، جریر بن حازم، عبیداللہ بن عمر، ابن اسحاق، محمد بن جعفر بن ابی کثیر، معمر، ہشام بن سعد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری رحمہم اللہ اجمعین۔

جلالت شان | زید اگرچہ غلام تھے۔ لیکن اُن کا علمی دبدبہ کسی سلطان سے کم نہ تھا وہ جب چاہتے خود حدیث بیان کرنے لگتے تھے، خاموش ہو جاتے تو اُٹھ کر واپس تشریف

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶

لیجاتے کسی شخص کو اُن سے سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی - ابن عجلان کا بیان ہے مجھ پر کبھی کسی شخص کی ہیبت نے اتنا اثر نہیں کیا جتنا زید بن اسلم کی ہیبت نے - اور حقیقت بھی یہ ہے کہ زید نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے - بے ڈھنگے سوالات سے ان کو طبعاً بڑی ناگواری ہوتی تھی - ایک مرتبہ ابن عجلان نے اُن سے کوئی بات پوچھی تو اُنہوں نے فرمایا "جاؤ! پہلے یہ سیکھو کہ سوالات کس طرح کئے جاتے ہیں، پھر میرے پاس آؤ" ایک دفعہ حضرت زید نے کوئی حدیث بیان کی، اس پر ایک شخص بولا "آپ نے یہ کس سے سُنی ہے؟" فرمایا "اے بھتیجے ہم بے وقوفوں کی صحبت میں نہیں بیٹھتے تھے"[1]

هر دلعزیزی اُن کا یہ رعب داب اُن کی علمی جلالت وعظمت کی وجہ سے تھا - ورنہ ویسے وہ بہت ہر دلعزیز اور محبوب کل تھے - اُن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میرے پدر بزرگوار کے چند ہم نشین تھے، اُن میں سے کسی کے پاس میرے والد مجھ کو کبھی کسی کام سے بھیجتے تھے تو وہ فرطِ شفقت سے میرے سر کو چھوتے اور اُسے بوسہ دیتے اور کہتے کہ بخدا تمہارے والد مجھ کو میرے بال بچوں اور گھر والوں سے زیادہ عزیز ومحبوب ہیں، اگر خدا مجھ کو اُن میں اور زید بن اسلم میں اختیار دے تو میں یہ پسند کروں گا کہ میرے سب اہل وعیال مرجائیں اور میرے لئے صرف زید زندہ وسلامت رہیں"[2] ابو حازم کہتے تھے "مجھ کو خدا وہ دن نہ دکھائے جبکہ میں زید کے انتقال کی خبر سنوں - اب کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہا جو میرے دین اور نفس کے اعتبار سے مجھ کو اُن سے زیادہ پسند ہو" چنانچہ جب انہیں زید کے انتقال کی خبر پہنچی تو اُن پر ایسی بے ہوشی طاری ہوگئی کہ وہ اُن کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکے[3]

فقہ فقہ میں بھی اُن کو بڑی دسترس حاصل تھی - حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، امام نووی سب اُن کو فقیہ امام مانتے ہیں -

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۵ و ۳۹۶ - [2] ایضاً ص ۳۹۶ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴

زہد و اتقاء | علمی کمالات کے ساتھ اُن کی کلاہِ افتخار میں اخلاقی و عملی کمالات کا طرۂ امتیاز بھی لگا ہوا تھا، حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان من العلماء الابرار"۔ ابن عیینہ کا بیان ہے۔ "کان زید بن اسلم رجلاً صالحاً"[1] امام نووی بھی انہیں "صالح تابعی" لکھتے ہیں۔ حدیث میں نیک لوگوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اُنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ حضرت زید اس کے صحیح مصداق تھے۔ ابو حازم کہا کرتے تھے "اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں زید کو دیکھتا ہوں تو اُن کے دیدار سے ہی تیری عبادت کی قوت مجھ میں پیدا ہو جاتی ہے پھر اُن کی ملاقات اور اُن سے بات چیت کا تو کیا کچھ اثر نہ ہوگا"[2]

وفات | ۱۳۶ھ میں وفات پائی[3]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [2] ایضاً [3] ایضاً

یزید بن ابی حبیب

نام ونسب | یزید نام، ابورجا کنیت، والد کی کنیت ابی حبیب اور نام سوید تھا۔ قریش کی ایک شاخ بنی عامر بن لوئی کے غلام تھے۔

پیدائش | حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے، مصر میں نشوونما پائی۔ اسی وجہ سے اُن کو مصری کہتے ہیں[1]۔

فضل وکمال | فضل وکمال کے لحاظ سے ائمہ تابعین میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی اُنہیں "الامام الکبیر" اور ابن عماد الحنبلی "شیخ مصر" لکھتے ہیں۔ مصر میں انہی کی ذات سے علم کا چرچا ہوا۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ "یزید سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصر میں علم ظاہر کیا اور حلال وحرام کے مسائل کو پھیلایا۔ اس سے قبل لوگ صرف ترغیبات اور فتن کا ذکر کرتے تھے[2]"۔

حدیث | حضرت یزید مصر کے ممتاز امام حدیث تھے۔ حافظ ذہبی انہیں "حجۃ حافظ للحدیث[3]" اور علامہ ابن سعد "ثقۃ کثیر الحدیث" لکھتے ہیں[4]۔ ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں[5]۔

شیوخ | اُنہوں نے حدیث میں کثیر التعداد ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا جن میں سے چند نام یہ ہیں:۔ عبداللہ بن حارث، ابوالطفیل، اسلم بن یزید، ابی عمران، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، عطا بن ابی رباح، عراک بن مالک اور امام زہری۔

تلامذہ | ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، اُن میں چند یہ ہیں:۔ سلیمان التیمی، محمد بن اسحاق۔ زید بن ابی انیسہ، عمرو بن الحارث، عبدالحمید بن جعفر، ابن لہیعہ، اور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷ [2] ایضاً ص ۱۲۱ و ۱۲۲ [3] ایضاً ص ۱۲۲ [4] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۰۲

[5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹ -

لیث بن سعد[1]

فقہ | حدیث کے ساتھ انہیں فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں "المصری الفقیہ" لکھتے ہیں[2]۔ مصر کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جو تین مفتی مقرر کئے تھے حضرت یزید بن ابی حبیب بھی اُن سے ایک تھے[3]۔

جلالت شان | یہ علمی کمالات کا وقار بہت ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیز نے پیغام بھیجا کہ "مجھ کو آپ سے چند مسائل دریافت کرنے ہیں۔ ازراہِ کرم کسی وقت تکلیف گوارا کر کے تشریف لائیے" آپ نے جواباً کہلا بھیجا "تم خود میرے پاس آؤ، کیونکہ تمہارا میرے پاس آنا تمہارے لئے زینت اور میرا تمہارے پاس جانا تمہارے لیے عیب ہے[4]"۔

صاف گوئی | امراء سے اس درجہ استغناء کے باعث انہیں بڑے سے بڑے جابر وظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جبکہ آپ بیمار تھے مصر کا امیر حوثرہ بن سہیل آپ کی عیادت کے لئے آیا اور پوچھنے لگا "اے ابو رجاء جس کپڑے پر مچھر کا خون لگ جائے اُس کا کیا حکم ہے؟ اُس کے ساتھ نماز ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟" آپ نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا۔ پھر جب حوثرہ چلنے لگا اور حضرت یزید نے اُسے دیکھا تو فرمایا "تم روزانہ خلقِ خدا کا خون بہاتے ہو لیکن مجھ سے مسئلہ مچھروں کے خون کا دریافت کرتے ہو![5]"

حلم وعقل | اُن کی یہ صاف گوئی کسی تند مزاجی پر مبنی نہیں تھی، ویسے وہ بہت بردبار اور خلیق وملنسار تھے۔ ابن یونس کا بیان ہے۔ "وکان حلیماً عاقلاً"۔ حضرت یزید خود فرماتے ہیں "اگر میرا کوئی بھائی مجھ پر غضبناک ہوتا ہے تو میں اُس کو دوبارہ غضبناک ہونے کا موقع

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۱ [3] ایضاً ص ۱۲۱ [4] ایضاً ص ۱۲۲ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲۔

نہیں دیتا۔ بلکہ اُس کے غصہ کا اصل سبب دریافت کرتا ہوں اور پھر جو بات اُس کو بُری لگتی ہے اُسے چھوڑ دیتا ہوں۔[۱]

علماء کا اعتراف | ان کمالات کی وجہ سے علماء معاصرین اُن کا بڑا احترام کرتے تھے لیث بن سعد انہیں "سید نا و عالمنا" کہتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ لیث بن سعد انہیں اور عبید اللہ بن جعفر کو اپنے ملک کے دو جوہر بتاتے تھے۔[۲] ابن وہب کہتے ہیں "اگر ان دونوں کو ایک ترازو میں رکھ دیا جائے تو دونوں برابر رہینگے۔ کسی کو دوسری پر ترجیح نہیں ہوگی[۳]

رجوع خلق | پبلک میں اُن کو عام ہر دلعزیزی اور عزت حاصل تھی۔ کسی خلیفہ کے ہاتھ پر جب تک یزید بن ابی حبیب اور عبید اللہ بن جعفر بعیت نہیں کر لیتے تھے کوئی اور شخص اقدام کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس عام شہرت و ہر دلعزیزی کے باعث ان کے پاس مسائل دریافت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آخر کار آپ نے تنگ آکر خانہ نشینی اختیار کر لی۔[۴]

حلیہ | رنگ آبنوس کی طرح سیاہ تھا۔[۵]

وفات | ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔[۶]

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲ ۲ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹ ۳ ایضاً ۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲ ۵ ایضاً

۶ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲

ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان

نام و نسب عبداللہ نام والد کا نام ذکوان تھا۔ کینت ابو عبدالرحمٰن تھی، لیکن وہ ابوالزناد کے لقب سے اتنے مشہور ہوئے کہ لوگ ابو عبدالرحمٰن بھول گئے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی رملہ کے غلام تھے اس لیے قرشی کہلاتے تھے بعضوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے خاندان کے غلام تھے[1]

ولادت ان کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا اور اُس وقت اُن کی عمر ۶۶ برس کی تھی[2]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۴ھ میں پیدا ہوئے ہونگے۔ تابعین کرام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

علم و فضل ابوالزناد نے انس بن مالک، ابوامامہ، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، شعبی، علی بن الحسین اور سعید بن المسیب اور عبداللہ بن جعفر سے سماع کیا تھا۔ ان بزرگوں کے فیضِ صحبت اور اُن کے اپنے طبعی رحجان و استعداد نے انہیں علم و فضل کے آسمان کا کوکبِ تاباں بنا دیا۔ امام نووی لکھتے ہیں "اور لوگوں نے متفقہ طور پر ابوالزناد کی کثرتِ علم، قوت حفظ، فضل، تنوع و تفنن فی العلوم، اور اُن کی ثقاہت و توثیق اور اُن کے قابلِ حجت ہونے پر اتفاق کیا ہے اور سب نے مل کر اُن کی بڑی ثنا کی ہے[3]"

حضرت سفیان فرماتے ہیں "ابوالزناد حدیث میں امیر المومنین ہیں[4]"، امام بخاری فرماتے ہیں "بہترین سندیں دو ہیں ایک "مالک عن نافع عن ابن عمرؓ" اور دوسری "ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ" علی بن المدینی کہتے ہیں "کبارِ تابعین کے بعد ابن شہاب، یحییٰ بن سعید، ابوالزناد اور بکیر بن عبداللہ بن اشج سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔

[1] تہذیب الاسماء واللغی ج ۲ ص ۲۴۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۴ [3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۴۳ [4] تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷

تلامذہ | ان کا دامانِ فیض بھی بڑا وسیع تھا جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا بڑے پایہ کے علماء شمار کئے جاتے تھے، مثلاً ابن ابی ملیکہ، ہشام بن عروہ، ابو اسحاق الشیبانی اور عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم وغیرہم

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا یہاں تک کہ مدینہ کے اکابرِ فقہا میں شمار ہوتا تھا۔ حافظ ذہبی اُنہیں "فقیہ المدینہ" لکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ انہیں ربیعہ سے بڑا فقیہ بتاتے ہیں[1]۔

جامعیت | ایک حدیث و فقہ ہی کیا، اُنہیں تقریباً تمام علومِ متداولہ میں یکساں مہارت حاصل تھی مصعب الزبیری کہتے ہیں "ابو الزناد اہل مدینہ کے فقیہ تھے اور کتابت و حساب کے بھی ماہر تھے۔ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ کے دفاتر سرکاری کی جانچ پڑتال انہیں کے سپرد تھی[2]۔

عبدربہ بن سعید کا بیان ہے ایک مرتبہ میں نے ابو الزناد کو دیکھا کہ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں داخل ہوئے تو اُس وقت اُن کے ساتھ جیسا بادشاہوں کے جلوں میں ہوتا ہے، تین سو طلباء کا جم غفیر تھا۔ اس مجمع میں کچھ لوگ فرائض، کچھ ریاضی اور حساب، چند ایک شعر و شاعری، کچھ حدیث اور بعض کسی اور مسئلہ کی نسبت سوال کر رہے تھے۔ اور وہ سب کو جواب دیتے جاتے تھے"[3]

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "کان ابو الزناد ثقۃ کثیر الحدیث فصیحاً بصیراً بالعربیۃ عالماً عاقلاً" ابن حبان کے نزدیک وہ ثقہ ہیں، فقیہ اور صاحبِ کتاب ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں "اُن کی تمام حدیثیں درست اور صحیح ہیں"[4]، امام نسائی۔ عجلی۔ ساجی اور ابو جعفر الطبری سب نے ان کو ثقہ مانا ہے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷ - [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۰۴

[4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۵

ولایت | حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو اپنے عہد میں عراق کے خراج کا منصرم بھی بنایا تھا۔ ان کے ساتھ عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کام کرتے تھے[1]

وفات | ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں جبکہ ایک مرتبہ یہ غسل کر رہے تھے ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۲

ربیعۃ الرائی

نام ونسب | ربیعہ نام، ابوعثمان کینت، رائی لقب، باپ کا نام فروخ اور ابوعبدالرحمٰن کینت آلِ منکدر کے غلام تھے۔

پیدائش اور تعلیم | ان کی پیدائش اور تعلیم کا عجیب واقعہ ہے، حضرت ربیعہ کے والد ابو عبدالرحمٰن فروخ کو بنو اُمیہ کے عہد میں خراسان کی ایک مہم پر جانا پڑا، اُس وقت ربیعہ شکمِ مادر میں تھے۔ فروخ نے چلتے وقت اپنی بیوی کے پاس تیس ہزار دینار گھر کے اخراجات کے لئے چھوڑ دئے تھے۔ خراسان پہنچ کر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ فروخ پورے ستائیس برس تک وطن (مدینہ) واپس نہ آسکے۔ ربیعہ کی والدہ نہایت روشن خیال اور عقلمند تھیں۔ ربیعہ سِن شعور کو پہنچے تو اُنھوں نے اُن کے لئے تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا اور اس سلسلہ میں جتنا روپیہ اُن کے پاس تھا سب خرچ کر ڈالا ستائیس برس کے بعد جب فروخ مدینہ واپس آئے تو اس شان سے کہ گھوڑے پر سوار تھے، اور ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ مکان پر پہونچ کر نیزے کی نوک سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک سُن کر ربیعہ دروازہ پر آئے۔ اس وقت باپ بیٹے آمنے سامنے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا تھا۔ ربیعہ نے فروخ کو اجنبی سمجھ کر کہا۔ "اے دشمنِ خدا! تو میرے مکان پر حملہ کرتا ہے؟" فروخ بولے "نہیں، بلکہ اے دشمنِ خدا! تو میرے حرم میں گھسا ہوا ہے" اسی میں بات بڑھ گئی، اور نوبت بایںجا رسید کہ دونوں ایک دوسرے سے دست گریباں ہوگئے۔ اس شوروغل اور ہنگامہ کی آواز سے آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے۔ شدہ شدہ خبر امام مالک بن انس کو بھی پہنچ گئی۔ ربیعہ اس وقت گو عمر کے لحاظ سے نوجوان تھے، لیکن علم

وفضل میں اُن کا چرچا دور دور تک پھیل گیا تھا، اور امام مالک ایسے ائمہ حدیث اُن کی درس میں شریک ہوتے تھے۔ امام مالک اور اُن کے ساتھ بعض دوسرے مشائخ وقت اس لئے یہاں آئے تھے کہ اپنے اُستاذ حضرت ربیعہ کی امداد کریں۔ امام مالک جس وقت یہاں پہنچے تو ربیعہ اُس وقت فروخ سے کہہ رہے تھے "خدا کی قسم! میں تم کو بادشاہ کے پاس لیجائے بغیر نہیں مانونگا" اس پر فروخ کہتے تھے "اور میں تم کو کس طرح بادشاہ کے سامنے پیش کرنے سے باز رہ سکتا ہوں۔ جبکہ تم یہاں میری بیوی کے پاس ہو" لوگ درمیان میں بیچ بچاؤ کرا رہے تھے۔ لیکن شور و شغب برابر بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے امام عالیمقام حضرت مالک بن انس کو آتے ہوئے دیکھا تو سب چپ ہو گئے۔ امام نے آتے ہی فروخ سے مخاطب ہو کر فرمایا "بڑے میاں! آپ کسی دوسرے گھر میں قیام کر لیجئے" فروخ بولے "یہ تو میرا ہی گھر ہے، میرا نام فروخ ہے اور میں بنو فلاں کا غلام ہوں"، حضرت ربیعہ کی ماں نے اندر سے جو یہ سُنا تو باہر نکل آئیں اور اُنہوں نے کہا "ہاں یہ فروخ میرے شوہر ہیں اور یہ ربیعہ میرے لڑکے ہیں۔ فروخ جب خراسان کی مہم پر جا رہے تھے، ربیعہ میرے شکم میں تھے۔ اس حقیقت کے کھُل جانے پر باپ بیٹے دونوں نے معانقہ کیا اور خوب مل کر روئے۔ اب فروخ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی سے ربیعہ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ میرا بیٹا ہے؟" بولیں "ہاں" تھوڑی دیر کے بعد فروخ نے بیوی سے اُس روپیہ کے متعلق دریافت کیا جو وہ خراسان جاتے ہوئے ان کو دے گئے تھے، اور کہا کہ لو میرے ساتھ یہ چار ہزار دینار اور ہیں۔ یہاں یہ سب روپیہ حضرت ربیعہ کی تعلیم پر خرچ ہو چکا تھا۔ بیوی بولیں "میں نے وہ مال دفن کر دیا ہے۔ چند روز کے بعد نکال دونگی، ابھی ایسی جلدی کیا ہے"، معمول کے مطابق حضرت ربیعہ وقت پر مسجد میں تشریف لے گئے اور درس دینا شروع کر دیا جس میں امام مالک، حسن بن زید ابن ابی علی، اور دوسرے اعیان مدینہ شریک تھے۔ والدۂ ربیعہ نے درس کا وقت

پہچان کر فروخ سے کہا کہ جاؤ نماز مسجد نبوی میں پڑھنا، اب فروخ یہاں آئے، نماز پڑھی پھر انہوں نے دیکھا کہ درسِ حدیث کا ایک زبردست حلقہ قائم ہے۔ ان کو سننے کا شوق ہوا، حلقہ کے قریب چلے آئے۔ لوگوں نے اُن کو دیکھ کر راستہ دینا شروع کر دیا حضرت ربیعہ نے درس میں خلل پڑنے کے خیال سے سر جھکا لیا، اور ایسے ہو گئے کہ گویا انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ فروخ اس حالت میں انہیں شناخت نہ کر سکے۔ لوگوں سے پوچھا "یہ کون ہیں؟" جواب ملا "ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن" ابو عبد الرحمٰن فروخ فرطِ مسرت سے بیتاب ہو گئے اور کہنے لگے "اللہ نے میرے بیٹے کا مرتبہ بلند کیا ہے"، گھر واپس آئے تو بیوی سے بولے "میں نے آج تمہارے بیٹے کو ایسی شان میں دیکھا ہے کہ کسی صاحب علم و فقہ کو نہیں دیکھا" اب حضرت ربیعہ کی والدہ نے کہا "آپ کو کیا چیز زیادہ پسند ہے، وہ تیس ہزار دینار یا یہ جاہ و منزلتِ علمی؟" فروخ بولے "نہیں خدا کی قسم یہ وجاہت زیادہ محبوب ہے"۔ کہنے لگیں "میں نے وہ سب روپیہ اسی پر صرف کر دیا ہے" فروخ نے کہا "تم نے وہ روپیہ صحیح مصرف میں خرچ کیا ہے"[1]

علم و فضل حضرت ربیعہ کی عاقلہ و فرزانہ والدۂ ماجدہ نے جس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کی تعلیم پر روپیہ خرچ کیا تھا، اُس کا صلہ اُن کو یہ ملا کہ اُن کا فرزندِ ارجمند ایک غلام زادہ ہونے کے باوجود علم و فضل کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکا اور دنیا کو اپنی فیض بار شعاعوں سے فائدہ پہنچایا۔ حضرت ربیعہ کی جلالتِ شان علم تمام علماء و محدثین میں مسلم ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں "تمام علماء محدثین اُن کی توثیق، جلالت، اور علم و فہم میں اُن کی بلندی مرتبت پر متفق ہیں"[2] ابن الماجشون کہتے ہیں "میں نے ربیعہ سے بڑھ کر کوئی حافظِ سنت نہیں دیکھا"[3] سوار بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے ربیعۃ الرائی سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ اس پر کسی نے اُن سے پوچھا "حسن اور

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴، ۴۲۲ [2] تہذیب الاسماء ج ا ص ۱۹۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۴۹

ابن سیرین بھی نہیں ؟ بولے "ہاں حسن اور ابن سیرین بھی نہیں"[1] حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں "وکان اماماً حافظاً فقیہاً مجتہداً بصیراً بالرای"[2]

حدیث | حضرت ربیعہ نے متعدد صحابۂ کرام اور کئی ایک تابعین عظام سے فیض صحبت اٹھایا تھا جس کی وجہ سے وہ حدیث کے ممتاز حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ خطیب بغدادی اور حافظ ذہبی اُن کو "حافظ للحدیث" لکھتے ہیں۔ اُنہوں نے جن ائمۂ حدیث سے روایت کی ہے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ حضرت انس، سائب بن یزید، محمد بن یحییٰ بن المسیب، قاسم بن محمد، ابن ابی لیلیٰ، اعرج، مکحول، حنظلہ بن قیس الزرقی وغیرہم۔

حضرت ربیعہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ قیاس اور رائے سے زیادہ کام لیتے ہیں اسی بنا پر اُن کو رائی کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ حافظِ سنّت تھے اور اُن کی جو رائے ہوتی تھی سُنّت کی روشنی میں ہوتی تھی، چنانچہ عبد العزیز بن ابی سلمہ نے ایک مرتبہ اہل عراق کو خطاب کر کے کہا "اے عراق والو تم ربیعہ کو رائی کہتے ہو، حالانکہ میں نے اُن سے بڑا کوئی حافظِ سُنّت نہیں دیکھا"[3] حافظ ابن حجر اُن کو ثقہ کثیر الحدیث بتاتے ہیں۔

فقہ | فقہ حضرتِ ربیعہ کی کلاہِ افتخار کا طرۂ امتیاز ہے، اور اُن کی شہرت اسی میں زیادہ ہے وہ اس میں امامت و اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی انہیں امام فقیہہ و مجتہد لکھتے ہیں خطیب بغدادی بھی انہیں حافظ للفقہ والحدیث کا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں[4] امام مالک جو خود بہت بڑے فقیہ اور امام تھے، حضرتِ ربیعہ کی وفات ہوئی تو اُنہوں نے فرمایا "ذھبت حلاوۃ الفقہ" فقہ کا مزہ ہی جاتا رہا۔[5] امام ابو حنیفہ بھی حضرت ربیعہ کے تلمیذ تھے۔ ابن زید کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو حضرت ربیعہ کی خدمت

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸

[4] خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴ [5] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۹

میں دیکھا ہے، اُن کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ربیعہ جو کچھ فرمائیں اُسے کما حقہ سمجھ لیں۔[۱]

ذہانت و فطانت | اُن کے فقہی کمال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ فطرتاً نہایت ذہین و فطین واقع ہوئے تھے۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں "میں نے ربیعہ سے زیادہ کوئی صاحب فطانت و ذہانت نہیں دیکھا"۔ ایک دوسری روایت میں اُن کے الفاظ ہیں ما رأیت احداً اسدّ عقلاً من ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن"۔[۲]

فتویٰ | اس فقہی کمال کی وجہ سے اُن کو مدینہ طیبہ میں افتاء کا شرف حاصل تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "وکان صاحب الفتویٰ بالمدینۃ"۔[۳]

احتیاط | لیکن فتویٰ دینے میں وہ بڑے محتاط تھے۔ جب تک کسی چیز سے متعلق اُن کو ذاتی طور پر تسلی و تشفی نہیں ہوتی تھی وہ اس پر کوئی حکم نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے مرض الموت میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے اُن سے کہا "ہم کو آپ اب تک تعلیم دیتے رہے ہیں لیکن ہمارے پاس بعض اوقات لوگ ایسی چیزوں کی نسبت سوال کرتے ہیں جن کے بارہ میں ہم نے آپ سے کچھ نہیں سُنا تو کیا ایسے مواقع پر آپ ہم کو اجازت دیتے ہیں کہ اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دے دیں، کیونکہ ہماری رائے اُن کی رائے سے بہر حال بہتر ہوگی"۔ حضرت ربیعہ یہ سُن کر بولے "مجھ کو ذرا بٹھا دو" اس کے بعد فرمایا "عبدالعزیز تم پر افسوس ہے، تم جاہل ہو کر مرو! یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم کسی چیز کے متعلق بغیر علم کے کوئی حکم بیان کرو۔ پھر نہیں نہیں، تین مرتبہ فرمایا۔[۴] یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں۔ حضرت ربیعہ بڑے بڑے مشکل مسائل کو حل کرتے تھے اور اہل مدینہ کے رئیس الفتویٰ تھے۔[۵]

اہل عراق نے ان پر قیاس آرائی اور رائے زنی کی جو تہمت لگائی تھی حضرت ربیعہ اُس سے بہت ناراض تھے۔ چنانچہ جب وہ عراق جانے لگے تو اُنہوں نے امام مالک

۱؎ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۲ ۲؎ ایضاً ص ۴۲۳ ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸

۴؎ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۹۵ ۵؎ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۸۹

سے فرمایا "اگر تم یہ سُنو کہ میں نے اہلِ عراق کے سامنے کوئی حدیث بیان کی ہے یا کسی مسئلہ میں اُن کو فتویٰ دیا ہے تو تم مجھ کو ناقابلِ اعتبار چیز سمجھنا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ عراق میں پہنچ کر بالکل خانہ نشین رہے۔ وہاں نہ کسی سے کوئی حدیث بیان کی اور نہ کسی مسئلہ میں کوئی فتویٰ دیا[1]۔

قضاء | کمالِ تفقہ کے باعث ابوعباس السفاح نے حضرت ربیعہ کو عہدۂ قضا پیش کرنا چاہا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے کسی بہانہ سے اُس نے اُن کو انبار بلوا بھی لیا تھا[2]۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے سفاح کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ حضرت ربیعہ طبیعت کے نہایت خوددار اور آزادی پسند تھے اور وہ سفاح سے کشیدہ خاطر بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ سفاح نے اُن کی خدمت میں ایک تحفہ بھیجا تو اُنہوں نے اُس کو رد کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے پچاس ہزار درہم بھیجے تاکہ حضرت ربیعہ اُن سے اپنی خدمت کے لئے کوئی لونڈی خرید سکیں۔ آپ نے یہ رقم بھی قبول نہیں کی[3]۔ اس کے علاوہ آپ کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ اس عہدہ کو ایک دنیا دارانہ مشغلہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن یحییٰ بن سعید سے اُنہوں نے باتوں باتوں میں قضا کی نسبت ارشاد فرمایا کہ "یہ تمہارے لئے اُن چیزوں میں بہتر ہے جو تم دنیوی مال و متاع سے حاصل کرنی چاہتے ہو[4]"

درس | جیسا کہ شروع میں گذر چکا ہے، حضرت ربیعہ مسجدِ نبوی میں حدیث کا اور فقہ کے مسائل کا درس دیتے تھے۔ جس میں بڑے بڑے اعیان علماء شرکت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُن کے حلقہ میں چالیس چوٹی کے علماء شامل تھے جن کے سروں پر عمامے بندھے ہوئے تھے۔ اُن کی تقریر عقل و حکمت کے مضامین سے پُر ہوتی تھی۔ ابن زید کا بیان ہے کہ حضرت ربیعہ ایک زمانہ تک خانہ نشین رہے جس میں

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۵ [2] ایضاً ص ۴۲۱ [3] ایضاً ص ۴۲۵ [4] ایضاً ص ۴۲۳۔

اُن کا مشغلہ بجز شب و روز نماز پڑھنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر اُنہوں نے لوگوں میں نشست و برخاست شروع کر دی۔ اور وہ جب کبھی بولتے تھے عقل و حکمت کی باتیں کرتے تھے[1]۔

تلامذہ | اُن کے فیضانِ درس نے ایک کثیر جماعت کو علم و عمل کا پیکر بنا دیا۔ جن میں امام مالک بن انس۔ یحییٰ بن سعید الانصاری، اور سلیمان التیمی، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان الثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد اور ابو ضمرہ بھی شامل ہیں[2]۔ یحییٰ بن سعید عمر میں حضرت ربیعہ سے بڑے تھے لیکن بقول متنبی۔

وشیخ فی الشباب ولیس شیخاً یسمّٰی کل من بلغ المشیبا

حضرت ربیعہ پھر بھی یحییٰ کے شیخ تھے۔ اور وہ اگرچہ خود بھی اس پایہ کے عالم اور بزرگ تھے کہ حضرت ربیعہ کی غیر موجودگی میں بہترین حدیثیں لوگوں کو سناتے اور اُن کا درس دیتے تھے۔ لیکن شیخ کی عظمت و جلالتِ شان کا یہ عالم تھا کہ اثناءِ درس میں آجاتے تو یحییٰ رُک جاتے تھے[3]۔

یحییٰ بن سعید تو پھر بھی تلمیذ تھے۔ حضرت ربیعہ کی امامت و وسعتِ نظر کا اعتراف خود اُن کے اساتذہ کو بھی تھا۔ چنانچہ قاسم بن محمد جو اُن کے شیخ ہیں، اُن کے پاس اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں فتویٰ لینے آتا اور انہیں اس کا جواب قرآن مجید یا سُنتِ نبوی میں معلوم ہوتا تھا تو وہ اُسے فتویٰ دے دیتے تھے۔ ورنہ فرماتے کہ تم ربیعہ یا سالم کے پاس جاؤ[4]۔

سیرت | ان علمی کمالات کے ساتھ وہ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ وہ سلاطین و امراء کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خرچ کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ اپنے ضرورتمند احباب۔ احباب

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸ [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴ [4] ایضاً

کی اولاد اور شاگردوں کی ضرورتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ابن وہب کا بیان ہے کہ ربیعہ بڑے سخی تھے۔ اُنہوں نے اپنے بھائیوں پر چالیس ہزار دینار خرچ کئے[۱]۔ ابن زید کہتے ہیں "میں نے مدینہ میں ربیعہ سے بڑا کوئی سخی نہیں دیکھا۔ ان کا مال جو کچھ اُن کے پاس تھا، اُن کے دوستوں، دوستوں کے بچوں یا سائلین کے لئے وقف رہتا تھا[۲]۔ وہ جس طرح اپنا مال دوستوں کے لئے وقف رکھتے تھے اُسی طرح ضرورت کے وقت اُن کو دوستوں سے روپیہ طلب کرنے میں بھی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُن کے متعلقین نے کہا "آپ نے اپنا سب مال تو خرچ کر دیا۔ اب دوستوں سے طلب کرتے پھرتے ہیں آپ کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس سے آپ کی شان میں بٹہ لگتا ہے" آپ نے فرمایا "میرا اور میرے دوستوں کا معاملہ ایک ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُن میں سے کوئی مجھ کو میری علمی وجاہت کی وجہ سے دیتا ہے[۳]۔

قوت گویائی حضرت ربیعہ کلام بہت کرتے تھے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ "خاموش آدمی خوابیدہ اور گونگے کے درمیان ہوتا ہے[۴]" اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک دن حضرت ربیعہ اپنی مجلس میں تقریر کر رہے تھے کہ اتفاق سے ادھر ایک اعرابی آنکلا، اور وہاں کھڑا ہو کر دیر تک آپ کی تقریر خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ حضرت ربیعہ نے خیال کیا کہ اعرابی اُن کی طلاقتِ لسانی اور فصاحت بیانی سے متاثر ہو گیا ہے۔ آپ نے اُس سے دریافت کیا "اے اعرابی! تم لوگوں کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟" اعرابی بولا "مختصر لفظوں کے ساتھ معنی صحیح صحیح ادا کرنا" پھر پوچھا "اور عجز عن الکلام کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "وہ جس میں تم مبتلا ہو" حضرت ربیعہ کو یہ سن کر بڑی ندامت ہوئی[۵]۔

وفات حضرت ربیعہ کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۳۰ھ بتاتا ہے اور کوئی

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۹ [۲] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴ [۳] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۳
[۴] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۹۴ [۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳۔

۱۳۶ھ لیکن موخر الذکر روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وقول من قال سنۃ ست وثلاثین ومائۃ اصحّ" علامہ ابن خلکان بھی اسی کو صحیح اور اور مورخین کا متفق علیہ بتاتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ربیعہ ہاشمیہ میں دفن کئے گئے تھے جس کو انبار میں سب سے پہلے خلیفۂ عباسی سفاح نے آباد کیا تھا۔ اور سفاح بروز جمعہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲ھ تخت نشین ہوا ہے اس بنا پر اگر ربیعہ کی وفات ۱۳۰ھ میں تسلیم کی جائے تو پھر ہاشمیہ میں اُن کا دفن ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

محمد بن عجلان

نام ونسب | محمد نام، ابو عبداللہ کنیت، مدینہ کے رہنے والے۔ اور فاطمہ بنت الولید بن عتبہ ابن ربیعہ کے غلام تھے، انہوں نے کم سنی میں بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ اس لیے اُن کا شمار صغار تابعین میں ہے۔ ان کے والد کا نام عجلان تھا جن کی نسبت خود محمد بن عجلان کا ایک عجیب بیان یہ ہے کہ "وہ شکمِ مادر میں تین سال رہے تھے"[1]

علم وفضل | علم وفضل اور زہد واتقاء کے لحاظ سے تابعین میں اُن کو مرتبہ بلند حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام القدوۃ" اور پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں "وہ مفتی، فقیہ، عالم عامل ربانی، بلند مرتبت بزرگ تھے"[2]

امام نووی لکھتے ہیں "ابن عجلان امام، فقیہ اور عابد تھے"[3] ابن عماد الحنبلی کہتے ہیں "وہ عابد، پابند شریعت اور صداقت شعار تھے"[4] ابن عجلان سراپا پیکر علم وفضل تھے عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ "کوئی شخص ابن عجلان سے بڑھ کر علماء سے مشابہ نہیں تھا۔ میں اُن کو تمام اربابِ علم میں یاقوت سے تشبیہ دیتا تھا"[5]

حدیث | حدیث میں اُن کو مرتبۂ کمال حاصل تھا۔ حافظ ابن حجر واقدی کا قول نقل کرکے فرماتے ہیں "ابن عجلان ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابو زرعہ، ابو حاتم، امام نسائی، عجلی، یحییٰ بن معین، اور ابن حبان سب اُن کو ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عیینہ سے کسی نے اُن کی نسبت دریافت کیا تو کہا "کان ثقۃً عالماً"[6]

اُنہوں نے صحابہ کرام میں انس بن مالک اور ابو الطفیل سے اور تابعین میں اپنے والد

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶ - [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۷ [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۴ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶ [6] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۴۲ -

ماجد، عکرمہ، نافع، سعید المقبری، اور رجا ابن حیوۃ، اعرج، اور ابوالزناد، زید بن اسلم وغیرہ سے سماعِ حدیث کیا تھا۔

درس | خاص مسجد نبوی میں درس دیتے تھے جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے لہ حلقۃ کبیرۃ فی مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ان کے خوشہ چینوں میں امت کے ائمہ کبار شامل تھے۔ مثلاً عبیداللہ بن عمر، منصور بن المعتمر، مالک بن انس، لیث بن سعد، ثوری، ابن عیینہ، حیوۃ بن شریح، شعبہ، قطان، عبداللہ بن ادریس اور ولید بن مسلم[2]

فقہ | فقہ میں بھی اُن کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ ابن سعد، حافظ ذہبی۔ اور امام نووی اُن کو فقیہ لکھتے ہیں۔ فتویٰ بھی دیتے تھے وکان یفتی[3]

عبادت اور زہد | ان علمی کمالات کے ساتھ زہد و ورع بھی اُن کی قبائے کمال کا تکمۂ زریں تھا حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "وکان احد العلماء العاملین" حافظ ذہبی انہیں "عالم ربانی" لکھتے ہیں۔ ابن سعد انہیں "عابدًا ناسکًا" کہتے ہیں۔

جلالتِ شان | علمی و عملی کمالات کے باعث لوگ اُن کو "مدینہ منورہ کا حسن بصری" سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی بات پر ناراض ہو کر گورنر مدینہ جعفر بن سلیمان نے اُن کو کوڑوں کی سزا دینے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اُس سے کہا "خدا تمہاری اصلاح کرے۔ اگر حسن بصری ایسا کرتے تو کیا تم اُن کو بھی کوڑے لگواتے" اُس نے کہا "نہیں" لوگوں نے کہا "تو پس ابنِ عجلان بھی مدینہ کے حسن ہیں" یہ سُن کر جعفر اپنے ارادہ سے باز آگیا اور اُنہیں معاف کر دیا۔

وفات | بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے اسکندریہ پہنچ کر کسی عورت سے نکاح کر لیا تھا۔ لیکن وہاں موافقت نہ ہو سکی۔ آپ پھر مدینہ واپس آ گئے جہاں ۱۴۸ھ یا ۱۴۹ھ میں وفات پائی رحمہ اللہ تعالیٰ[4]

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۰ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۴۲ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۷

محمد بن اسحاق

نام و نسب | محمد نام ابو عبد اللہ کنیت، والد کا نام اسحاق تھا۔ ان کے دادا الیسار عین التمر کے اسیران جنگ میں سے تھے۔ اسی بنا پر ابن اسحاق بھی قیس بن مخرمہ بن مطلب کے غلام لکھے جاتے ہیں۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے اُن کا شمار ممتاز تابعین میں ہے، علی الخصوص فنِ مغازی اور سیرت میں اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں "وہ علم کے سمندر تھے، نہایت ذکی، قوی الحافظہ، علم کے پُر شوق طالب، عالم اخبار (روایات) ماہر انساب، اور علامۂ روزگار۔"[1]

حدیث | حدیث میں اُن کو بڑا کمال حاصل تھا۔ شعبہ ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" اور "امیر المحدثین" کہتے ہیں۔ یزید بن ہارون کہتے تھے "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں محمد بن اسحاق کو محدثین کا امیر بنا دیتا۔"[2] علی بن المدینی کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا دار و مدار چھ اشخاص پر رہ گیا ہے۔ آپ نے اُن سب کے نام لیے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ "ان چھ شخصوں کا علم بارہ علماء کی طرف منتقل ہو گیا۔ انہی میں سے ایک محمد بن اسحاق ہیں۔"[3] ابو معاویہ کہتے ہیں کہ "ابن اسحاق اُن لوگوں میں سے تھے جو سب سے زیادہ قوی الحافظہ ہیں۔" ابراہیم الحربی سے کسی نے پوچھا "محمد بن اسحاق کے بارہ میں کسی نے کلام کیا ہے؟" بولے ان کی نسبت سفیان بن عیینہ تو یہ کہتے تھے کہ جب تک یہ لڑکا (محمد بن اسحاق) زندہ رہیگا مدینہ میں علم باقی رہیگا"، علی بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت سفیان کی زبانی سنا ہے، فرماتے تھے "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو محمد بن اسحاق کو متہم کرتا ہو۔"

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۴ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹۔

شعبہ ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں "اگر حدیث میں کسی کو سردار بنایا جائے تو محمد ابن اسحاق اس کے مستحق ہیں"[1]

امام زہری کا اعتماد | امام زہری اُن کے اُستاد تھے۔ لیکن وہ خود محمد بن اسحاق کی وسعتِ علم کی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری کسی سفر میں جانے لگے۔ طلبائے حدیث نے اُن کی دور تک مشایعت کی تو آپ نے فرمایا "تم میرے ساتھ کیوں جا رہے ہو۔ میں نے تم میں ایک غلام احول (محمد بن اسحاق) کو اپنا قائم مقام بنا کر چھوڑ دیا ہے" ساجی کا بیان ہے کہ "امام زہری کے اس ارشاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے طلباء کو امام زہری کی کسی روایت میں کوئی شک ہوتا تھا تو وہ محمد بن اسحاق سے ہی اُن کے حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے رفع شک کرتے تھے"[2] سفیان بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام زہری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں محمد بن اسحاق آ گئے۔ امام زہری نے اُن سے فرمایا "دیر کہاں کر دی؟" محمد بن اسحاق بولے "کیا آپ کے ہاں دربان کے ہوتے ہوئے کوئی آسانی سے آ بھی سکتا ہے؟" امام زہری نے یہ سنکر فوراً دربان کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ "محمد بن اسحاق جس وقت بھی آئیں اُن کو اندر آنے سے نہ روکا جائے" امام زہری کو محمد بن اسحاق پر جو اعتماد تھا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ فرماتے تھے "جب تک محمد بن اسحاق مدینہ کے لوگوں میں رہیں گے مدینہ میں علم بہت وافر رہیگا"[3]

شیوخ | انہوں نے حدیث میں قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ابان بن عثمان، محمد بن علی بن الحسین، امام زہری، نافع مولی عبداللہ بن عمر، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن، ابن المنکدر، مکحول، ابراہیم بن عقبہ، حمید الطویل، سالم ابو النضر، ابو الزناد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، یزید بن ابی حبیب، یزید بن رومان وغیرہم رحمہم اللہ سے سماعت کی تھی۔ حضرت انس بن مالک اور سعید بن المسیب کو بچپن میں دیکھا تھا۔ لیکن سماعت نہیں کر سکے۔ امام زہری سے

---

[1] دیکھو ان مقولوں کے لئے بغدادی ج ۱ ص ۲۲۷ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۲ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹

خصوصیت تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔[1]

تلامذہ | جن لوگوں نے اُن سے استفادہ کیا اور اُن کی حدیثیں قبول کیں اُن میں چند اکابر علم و دین کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت سفیان، شعبہ ابن عیینہ، حماد بن یزید، حماد بن سلمہ، ابن المبارک، ابراہیم بن سعد۔

علم سیر و مغازی | اُن کا خاص فن سیر و مغازی تھا جس میں اُن کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وہ علم کے ظرف تھے، مغازی اور سیر کے علم میں بڑے ماہر (حبر) تھے"[2] پھر اُن کے متعلق چند اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "جس چیز پر عمل مقرر ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ ابن اسحاق مغازی اور ایام نبویہ کے بیان میں مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں اگرچہ وہ بعض اوقات ایسی نرالی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں جن میں وہ منفرد ہوتے ہیں"[3] امام زہری سے کسی نے پوچھا "آپ محمد ابن اسحاق کی مغازی کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟" بولے "وہ تو ان روایات کے سب سے بڑے عالم ہیں"[4] امام شافعی فرماتے تھے "جو شخص مغازی میں مہارت پیدا کرنی چاہتا ہے اُس کو بجز اس کے چارہ نہیں کہ محمد بن اسحاق پر اعتماد کرے"[5]

اُن کی روایاتِ مغازی نے اس قدر شہرت پائی تھی کہ بادشاہوں کی محفلوں تک میں انہی کا ذکر ہوتا تھا۔ چنانچہ ابن عدی کا بیان ہے کہ "اگر محمد بن اسحاق کے لئے کوئی اور فضل نہ ہوتا اور صرف یہی ایک بات ہوتی کہ اُنہوں نے بادشاہوں کو بے معنی کتابوں کے مطالعہ سے منحرف کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مغازی اور آپ کی بعثت اور ابتدائے آفرینش کے ذکر و اذکار کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ تو یہ بھی ایسی فضیلت ہے جس کی جانب انہوں نے سبقت کی ہے۔ اس میں شک نہیں اس کے بعد بھی اُنکی طرح بعض لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن وہ اُن کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے۔ اُن کی حدیثیں بہت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳، [3] ۱۶۴ [4] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱ [5] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹

مشہور ہوئیں۔ مگر میں نے اُن میں کوئی ایسی حدیث نہیں پائی جس کی وجہ سے اُن پر ضعف کا قطعی حکم لگا دیا جائے، ہاں وہ بسا اوقات خطا بھی کر جاتے ہیں، یا کہیں کہیں اُنہیں کسی چیز میں شک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کی خطائیں تو دوسرے بھی کرتے ہیں اس سے اُن کی شان میں کوئی خاص نقص لازم نہیں آتا۔[۱]

جامعیت | وہ صرف علمِ حدیث و مغازی کے ہی بلند مرتبت عالم نہیں تھے بلکہ ہر قسم کے علم و فن سے دلچسپی رکھتے اور اُس میں گفتگو کرتے تھے۔ عبداللہ بن فائد بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن اسحاق کے پاس بیٹھتے تھے وہ جب کسی فن میں کلام شروع کرتے تو اُسی مجلس میں ختم کر کے اُٹھتے تھے۔[۲] علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وہ سیر و مغازی کے عالم، تاریخ عالم سے باخبر، آغاز آفرینش کی تاریخ سے واقف۔ اور انبیاء کرام کے قصوں سے آگاہ تھے۔ اور اُن سے ائمۂ علماء نے روایت کی ہے"[۳]

ثقاہت | وسعتِ علم اور ثقاہت خصوصاً نقاد حدیث کی نگاہ میں دو مختلف چیزیں ہیں جہاں تک وسعتِ علم کا تعلق ہے، قریب قریب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد بن اسحاق علم کے ناپید اکنار سمندر تھے اور خصوصاً اُن کو سیر و مغازی کے علم میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ حدیث کی کثرتِ روایات کا یہ عالم تھا کہ ابراہیم بن سعد کے پاس جو صرف احکام سے متعلق ابن اسحاق کی روایت کی ہوئی حدیثیں موجود تھیں اُن کی تعداد سترہ ہزار تھی۔[۴] لیکن چند وجوہ سے اُن کی ثقاہت میں بڑا اختلاف ہے، ایک طرف سفیان بن عیینہ کا بیان یہ ہے کہ "میں کچھ اوپر ستر سال تک محمد بن اسحاق کا ہمنشین رہا، اس مدت میں اہل مدینہ میں میں کوئی ایسا شخص نہیں پایا جو اُن کو متہم کرتا ہو، یا اُن کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات کہتا ہو۔"[۵] مفضل الغلابی نے یحییٰ بن معین سے اُن کی نسبت دریافت کیا تو اُنہوں نے فرمایا "کان

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۔ ۴۵ ۲ ایضاً ص ۴۱ ۳ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۱۵ ۴ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱ ۵ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱

ثقہ وکان حسن الحدیث[1] اسی طرح اور بھی بعض بڑے بڑے ائمۂ حدیث کے اقوال ہیں جن سے اُن کی ثقاہت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اُن کے برعکس دوسری جانب امام مالک اور ہشام ابن عروہ نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ اور اُن کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔

امام مالک اور ہشام بن عروہ کی شدید جرح کی وجہ

اس قدر سخت جرح کی وجہ کیا ہے؟ کیا وہ حقیقۃً ناقابلِ اعتبار تھا اور یا اس جرح کی وجہ کچھ خارجی اسباب ہیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ محمد بن اسحاق امام مالک کی روایات پر زیادہ اعتنا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے اُن کے سامنے امام ہمام کی چند روایتیں نقل کیں تو محمد بن اسحاق انہیں سُن کر ہنس پڑے اور پھر چپ ہو کر رہ گئے۔ ایک مرتبہ لوگوں سے کہا تم مجھ کو مالک کی حدیثیں سُنایا کرو میں اُن کے مرض کا طبیب ہوں" امام مالک نے یہ سُنا تو فرمایا " اچھا! ابن اسحاق یہ کہتا ہے کہ مالک کی حدیثوں کا طبیب (بیطار) ہوں! ہم نے تو اس کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا ہے"[2] اسی طرح ہشام بن عروہ کی جرح کا سبب بھی بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ محمد بن اسحاق ہشام کی بیوی فاطمہ بنت المنذر سے احادیث کی روایت کرتے تھے۔ ہشام نے یہ سُنا تو سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "ابنِ اسحق بالکل جھوٹ کہتا ہے میری بیوی کو تو اُس کی نو برس کی عمر سے جب سے میں نے اُس سے شادی کی ہے آج تک کسی مخلوق نے دیکھا ہی نہیں"[3] لیکن ادنیٰ تامل سے ان دونوں توجیہات کی رکاکت ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلی توجیہہ کے غلط ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ اگر بالفرض محمد بن اسحاق کی نسبت یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو امام مالک کی احادیث کا ڈاکٹر کہتے تھے تب بھی امام مالک ایسے بلند مرتبہ اور مسلم الثبوت امامِ عالیمقام سے یہ امر بہت مستبعد ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی انتقام کی وجہ سے ایک ثقہ کو کذاب اور دجال کہہ بیٹھیں۔ اب رہی ہشام کی جرح کی وجہ، تو اُس کی لغویت اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۹ [2] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۳ [3] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۲

کیونکہ اُس عہد میں مستورات سے احادیث کی روایت کرنے کا عام دستور تھا ام المومنین حضرت عائشہ جو جملہ "قرانِ نی بیوتکن" کی پردہ نشین خواتین میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہیں، خود اُن سے کثرت سے روایتیں مروی ہیں۔ اس بنا پر ہشام کا محض یہ سُن کر کہ محمد بن اسحاق اُن کی بیوی سے روایت کرتے ہیں۔ ناراض ہوکر اُن کو کذّاب کہنا قطعاً غیر معقول بات ہے۔ پھر اُس پر طرّہ یہ ہے کہ ہشام نے ابن اسحاق پر جو اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے میری بیوی کو دیکھا کس طرح؟ اُس کو تو نو برس کی عمر سے اب تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی عورت سے کوئی روایت نقل کرنا اُس کے دیکھنے کو مستلزم نہیں ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہشام جیسا شخص اتنی ذرا سی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اور وہ محض اپنی بیوی سے روایت کا ذکر سُنتے ہی لعن طعن شروع کردے اور تہمت طرازی کرنے لگے۔ اور وہ بھی کسی معمولی آدمی پر نہیں بلکہ محمد بن اسحاق ایسے سن رسیدہ صاحبِ علم وفضل پر۔

اِن دلائل کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ دونوں توجیہیں بالکل غلط ہیں کہ اُن سے محمد بن اسحاق کی ثقاہت ہی نہیں بلکہ خود امام مالک اور ہشام بن عروہ کی ثقاہت پر بھی حرف آتا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ خود محمد بن اسحاق میں جلالتِ علم کے باوصف بعض ایسی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث امام مالک نے جو علامہ خطیب بغدادی کے قول کے مطابق تنقید وتعدیل میں اتنے سخت تھے کہ اربابِ صلاح ودیانت اور اصحابِ ثقاہت وامانت کی شان میں بھی بعض مرتبہ نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے تھے[1] اُن پر شدید جرح کردی اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے خواہ محمد بن اسحاق کو کیسا ہی قوی الحافظہ مانا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود انہیں اپنی قوتِ حفظ پر پورا اعتماد نہیں تھا چنانچہ اُن کا معمول تھا کہ کسی شخص کے پاس پانچ یا اس سے زیادہ حدیثیں ہوتی تھیں تو وہ اُسے اپنی

---

[1] تاریخ بغدادی ج ا ص ۲۲۳

حدیث سنا کر فرماتے تھے "تم اس کو میری خاطر اپنے پاس ودیعت رکھ لو، ممکن ہے میں بھول جاؤں، تو تم مجھ کو یاد دلا سکو گے"[۱] اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مغازی کی روایات قبول کرنے میں نہایت نرم واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اُن یہودیوں کی روایتوں کو بھی قبول کر لیا جو بعد میں اگرچہ مسلمان ہو گئے تھے، لیکن یہودیت کے زمانہ میں انہوں نے غزوۂ خیبر وغیرہ کے جو واقعات جس طرح سُنے تھے اُسی طرح اُن کو بے تکلف نقل کرتے تھے[۲] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہ سہل انگاری صرف مغازی کے معاملہ میں ہی نہیں تھی۔ بلکہ احادیث میں بھی وہ بعض اوقات اسی طرح کا تساہل کر جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کے سامنے کسی نے اُن کا ذکر کیا تو فرمایا "محمد بن اسحاق ایک شخص تھے جو احادیث کے بڑے شوقین تھے، انہیں لوگوں کی کتابیں ملتی تھیں تو اپنی کتاب میں درج کر لیتے تھے" امام احمد سے ایک موقع پر کسی شخص نے پوچھا "اگر ابن اسحاق کسی روایت میں منفرد ہوں تو آپ اسے قبول کر لینگے؟" فرمایا "نہیں! خدا کی قسم میں نے اُن کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو ایک جماعت سے نقل کرتے تھے اور پھر اس کے اور اُس کے کلام میں کوئی فصل نہیں کرتے تھے"[۳]

تیسری وجہ یہ ہے کہ اُن پر قدری ہونے کا شبہ تھا۔ اور بعض لوگوں کے اقوال سے اس شبہ کی تقویت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ دحیم سے کسی شخص نے امام مالک کا قول اُن کی نسبت نقل کیا تو انہوں نے کہا "یہ حدیث کی نسبت نہیں ہے۔ اور وہ مغازی کے بارہ میں ہے بھی تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک وہ قدریہ عقائد سے متہم تھے"[۴] دحیم نے تو صرف اتہام کا ہی ذکر کیا ہے۔ ہارون بن معروف صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ وہ قدری تھے[۵] مکی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ محمد بن اسحاق نے صفاتِ باری

---

[۱] خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۰ [۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴ [۳] ایضاً ص ۴۳۔

[۴] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۴ [۵] ایضاً ص ۲۲۵۔

سے متعلق ایسی احادیث بیان کیں کہ مجھ کو اُن سے نفرت ہوگئی اور میں پھر اُن کے پاس کبھی نہیں گیا۔ ابن غسان کہتے ہیں "میں ۱۹۲ھ میں مدینہ طیبہ میں تھا، وہاں یزید بن ہارون حدیث کا درس دیتے تھے۔ میں بھی اُس میں شریک ہوتا تھا۔ اور اس حلقہ میں خاص اہلِ مدینہ کی بھی ایک جماعت ہوتی تھی۔ ایک دن اُنہوں نے درس دیتے دیتے محمد بن اسحاق کی چند روایتیں بیان کرنی شروع کردیں۔ اہلِ مدینہ یہ سُنتے ہی کہنے لگے "بس حضرت! اُن کی حدیثیں رہنے دیجئے، اُنہیں تو ہم خوب پہچانتے ہیں" یزید بن ہارون نے ہر چند ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ایک نہ مانے اور بالآخر اُنہیں درس ختم کرنا پڑا[۱]۔ پھر اس کے علاوہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے کبھی کبھی ایسے افعال بھی سرزد ہو جاتے تھے جن کی وجہ سے محدثین اور خصوصاً نقادِ حدیث کی نظر میں اُن کو پایۂ ثقاہت وحجیت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً ابن ابی عدی کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق مرغوں سے کھیلتے تھے[۲]۔ ظاہر ہے یہ باتیں ثقاہت کے سخت منافی ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر تنہا امام مالک اور ہشام بن عروہ ہی نہیں بلکہ اور بھی متعدد ائمۂ حدیث نے اُن کو حجت ماننے سے انکار کیا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں "وہ قوی نہیں ہیں" دار قطنی کا قول ہے "اُن سے احتجاج نہیں ہو سکتا[۳]" محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں "محمد ابن اسحاق کی مصیبت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات مجہول لوگوں کی روایت سے باطل حدیثیں نقل کردیتے ہیں[۴]" ابو عبداللہ کا بیان ہے "محمد بن اسحاق بغداد آئے تو وہ ہر کس وناکس سے روایت کردیتے تھے، اور ثقہ غیر ثقہ میں امتیاز نہیں کرتے تھے"

میں نے اپنے اُستاذ حضرتنا العلام مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ سے صحیح بخاری کے درس میں یہ بھی سُنا ہے کہ دراصل اخیر عمر میں تقاضائے پیری سے محمد بن اسحاق کا حافظہ بہت کمزور ہو گیا تھا، اور اس پر طرفہ یہ ہوا کہ اُن کا مجموعۂ احادیث جس سے وہ

---

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳ [۳] الضاً ص ۱۶۴ [۴] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۷

روایتیں پھر بھی بیان کرتے اور اُن میں زیادہ احتیاط نہیں برتتے تھے۔ اس بناء پر صحیح روایتیں غیر صحیح روایتوں سے اس طرح خلط ملط ہو گئیں کہ اُن میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ واللہ اعلم

اس تقریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق کی جلالتِ شان اور وسعتِ علم مسلم، لیکن محدثین کے خاص معیار کے مطابق اُن کی منفرد روایتوں کو لائقِ احتجاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ حافظ ذہبی کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں محمد بن اسحاق علم کے ظرف تھے مغازی اور سیر کا علم بہت وسیع رکھتے تھے۔ لیکن وہ ان چیزوں میں یقینی طور پر حجت نہیں۔ اُن کی حدیث پایۂ صحت سے فروتر ہے۔ اگرچہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے سچے اور پسندیدہ ہیں[1]۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں "وہ حلال و حرام میں حجت نہیں۔ مگر ہاں ایسے کچھ زیادہ کمزور بھی نہیں ہیں۔ اُن سے فی الجملہ سند لیجا سکتی ہے[2]"

تصانیف اُنہوں نے سیرت اور تاریخ پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ فہرست ابن ندیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مشہور تصنیف کتاب المغازی کے علاوہ ایک کتاب کتاب الخلفاء اور ایک کتاب السیرۃ والمبتداء کے نام سے بھی تھی[3]۔

ان کی مشہور کتاب سیرت ابن اسحاق ہے۔ ابن ہشام میں کثرت سے اسی کتاب سے روایتیں اخذ کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ایک مرتبہ محمد بن اسحاق خلیفہ عباسی مہدی کے پاس گئے تو اُس وقت اُس کے پاس اُس کا بیٹا موجود تھا مہدی نے کہا "اے ابن اسحاق! آپ اسے پہچانتے ہیں؟" بولے "کیوں نہیں؟" مہدی نے کہا "تو اچھا! آپ اس لڑکے کے لئے ایسی کتاب لکھئے جس میں حضرت آدم کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حالات و واقعات مذکور ہوں" آپ نے اس فرمائش کی تعمیل میں یہ کتاب لکھ کر پیش کی تو مہدی نے کہا "یہ تو بہت طویل ہو گئی ہے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳ [2] ایضاً ص ۱۶۴ [3] فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶۔

اسے مختصر کر دیجئے"، چنانچہ اُنہوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور جو مفصل کتاب تھی وہ خزانۂ شاہی میں محفوظ کر دی گئی۔ علامہ بغدادی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "راوی نے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ ابن اسحاق بجائے مہدی کے منصور کے پاس گئے ہونگے، اور اُس وقت اُس کے پاس مہدی موجود ہوگا۔ پھر منصور کی فرمائش پر اُنہوں نے یہ کتاب مہدی کے لئے لکھی ہوگی"[۱]

وفات

پہلے وہ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے پھر کوفہ، جزیرہ اور رے وغیرہ مختلف مقامات میں پھرتے رہے، آخر میں بغداد میں مقیم ہو گئے اور یہیں ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ میں وفات پائی، اور مقبرۂ خیزران میں دفن ہوئے۔

۱؎ تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۱

اتباعِ تابعینؒ وغیرہم

عبد اللہ بن مبارکؒ

نام و نسب ابو عبد الرحمٰن کنیت عبد اللہ نام والد کا نام مبارک تھا جو بنو حنظلہ کے ایک شخص کے غلام تھے مبارک اپنے آقا کے نہایت مطیع و فرمانبردار غلام اور پرہیز گار و متقی تھے۔ یہ باغ میں کام کرتے تھے ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان سے ایک ترش انار طلب کیا تو انہوں نے شیریں انار لیجا کر پیش کر دیا آقا کو بڑا غصہ آیا اور کہا "تم شیریں اور ترش میں بھی امتیاز نہیں کرتے" بولے "ہاں" اُس نے وجہ پوچھی تو کہا "آپ نے مجھ کو ترش انار کھانے کی اجازت نہیں دی ہے" آقا نے اِس بات کی تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا درست تھا۔ اس شخص کو مبارک کی اس درجہ دیانتداری پر سخت حیرت ہوئی اور اسی دن سے اُس کو ان کے ساتھ . . . گرویدگی پیدا ہو گئی[1] اس کے ساتھ ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ مبارک کے آقا نے اپنی لڑکی کی شادی کرنی چاہی تو اُن سے دریافت کیا "مبارک! میں اپنی اس بیٹی کی شادی کس سے کروں؟" اُنہوں نے کہا "عہد جاہلیت میں لوگ حسب کی تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو داماد بنانے کے لئے مالدار کی جستجو ہوتی تھی، اور عیسائی جمال کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک دیندار ہونا شرطِ شادی سمجھا جاتا ہے" مبارک کے آقا کو اُن کا یہ جواب بہت پسند آیا اور اُس نے اپنی بیوی سے جا کر کہا "میری بیٹی کا شوہر بننے کے لیے مبارک سے زیادہ مناسب کوئی اور شخص نہیں ہے" آخر کار میاں بیوی دونوں

---

۱ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۴ -

راضی ہو گئے اور اُس لڑکی کی شادی مبارک سے کر دی گئی[1]۔

ولادت | حضرت عبداللہ اسی بیوی کے بطن سے مرو میں ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور اِس مرو کی نسبت سے ہی مروزی کہلائے۔

تعلیم و تربیت | ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہونے کے باعث حضرت عبداللہ سے آثارِ کمال و ترقی بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ انہیں طلبِ علم کا اتنا شوق تھا کہ کم عمری میں بھی اس مقصد کے لئے سفر کرنے سے باز نہیں آتے تھے[2]۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "ابنِ مبارک کے زمانہ میں اُن سے زیادہ طالبِ علم کرنے والا کوئی نہیں تھا"[3] ابو اسامہ شہادت دیتے ہیں "میں نے دنیا میں عبداللہ بن مبارک سے زیادہ طلب علم کا جذبہ رکھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا[4] انہیں طلب علم کے شوق میں اپنی حیثیت کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی ہر چھوٹے اور بڑے سے علم حاصل کرتے تھے[5]"

علم و فضل | اس شوق و ذوق اور محنت و جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ہر علم و فن میں کمال حاصل ہو گیا بڑے بڑے ائمہ عصر اُن کی جامعیتِ علوم و فنون اور مہارت کا اعتراف کرتے تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ابن مبارک امام، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام فخر المجاہدین، قدوۃ الزاہدین تھے[6] عجلی انہیں "جامع للعلم" بتاتے ہیں۔ ابن حبان لکھتے ہیں۔

کان فیہ خصالٌ لم تجتمعْ فی احدٍ من اھل العلم فی زمانہ فی الارض کلھا۔	ابن مبارک میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ اُن کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں "عبداللہ بن مبارک کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہے وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی تھی اور اُن کی محبت

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۳ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۴
[4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۶ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۳ [6] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶

کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی تھی۔[1] علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "ابن مبارک نے علم طلب کیا، روایاتِ کثیرہ بیان کیں، علم کے مختلف ابواب وانواع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ زہد میں اور ترغیبِ جہاد میں اشعار کہے۔ علمِ کثیر کی سماعت کی۔ وہ معتبر تھے، مقتدا، حجت اور کثیر الحدیث تھے۔"[2]

حدیث حدیث اُن کا خاص فن تھا اس کے لیے اُنہوں نے شام، مصر، یمن، حجاز اور عراق کے طویل و دشوار سفر کیے، اور اُس زمانہ کے جلیل القدر ائمہ حدیث سے استفادہ کیا چنانچہ ان کے شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے۔ جس میں سے چند نام یہ ہیں۔

شیوخ سلیمان التیمی، سلیمان الاعمش، حمید الطویل، عبداللہ بن عون، یحییٰ بن سعید الانصاری، موسیٰ بن عقبہ، ابن جریج، مالک بن انس، سفیان الثوری، شعبہ، اوزاعی، ابوعوانہ، زہیر ابن معاویہ۔[3]

مہارتِ فن اِن اکابرِ اُمت کے فیضِ التفات اور خود اپنے ذاتی ذوق وشوق کے باعث عبداللہ ابن مبارک حدیث کے دریائے بیکراں بن گئے۔ اُن کی مہارت وامامت کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی اور بعض وہ امام جن سے سماعِ حدیث کا اشتیاق ابن مبارک رکھتے تھے خود وہ اُن کی حدیثیں سُننے کے مشتاق رہتے تھے۔ احمد بن سنان کا بیان ہے "عبداللہ بن مبارک پہلی مرتبہ حمّاد بن زید کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے پوچھا آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" بولے "خراسان سے" پوچھا "خراسان کے کس شہر سے؟" جواب دیا "مرو سے" پھر دریافت کیا "وہاں ایک شخص ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے آپ انہیں بھی جانتے ہیں؟" کہا "ہاں جانتا ہوں" پوچھا "وہ کس طرح ہیں؟" بولے "ابن مبارک ہی تو اس وقت آپ سے خطاب کر رہا ہے" حماد بن زید یہ سُن کر بے تاب ہو گئے۔ اُن کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔[4]

۱؎ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۵ ۲؎ ایضاً ص ۲۸۶ ۳؎ تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۲ ۴؎ ایضاً ص ۱۵۴۔

ابن مہدی کہتے تھے " ائمہ چار ہی ہیں امام مالک، ثوری، حماد بن زید۔ اور ابن مبارک " شعیب بن حرب کا بیان ہے " ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں تھا[1]" شعبہ کا بیان ہے " ہمارے پاس ابن مبارک ایسا بزرگ کوئی نہیں آیا " ابو اسامہ انہیں " امیر المومنین فی الحدیث " بتاتے ہیں شعیب بن حرب نے ایک مرتبہ کہا " میں نے ہر چند یہ چاہا کہ سال میں تین دن کے لئے ابن مبارک جیسا بن جاؤں لیکن نہ بن سکا[2]"

ایک مرتبہ یحییٰ بن معین کے سامنے کسی نے ابن مبارک کا ذکر کیا تو فرمایا " سید من سادات المسلمین " فضیل کہتے ہیں " رب کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا[3]"

اصحاب حدیث میں اگر کبھی اختلاف ہوتا تو ابن مبارک کی طرف رجوع کرتے تھے فضالۃ النوسی کہتے ہیں " میں کوفہ کے علماء حدیث کے پاس اُٹھتا بیٹھتا تھا ان حضرات میں اگر کسی حدیث سے متعلق نزاع ہوتا تھا تو یہ کہتے تھے " چلو حدیث کے اُس طبیب کے پاس چلیں اور اس حدیث کے بارہ میں پوچھیں " یہ طبیب عبداللہ بن مبارک تھے[4]

قوت حافظہ | حدیث کے لئے قوتِ حافظہ شرطِ اولیں ہے۔ عبداللہ بن مبارک کو قدرت نے اس نعمت سے بھی حصّہ وافر عطا فرمایا تھا۔ صخر حضرت عبداللہ بن مبارک کے ایک دوست تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ " بچپن میں ایک مرتبہ میں اور ابن مبارک دونوں ایک مقام سے گذر رہے تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص خطبہ دے رہا ہے۔ خطبہ طویل تھا، ہم دونوں سنتے رہے۔ خطبہ کے ختم پر ابن مبارک بولے " مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہو گیا " جماعت میں سے کسی شخص نے یہ فقرہ سن لیا۔ بولا " اچھا سناؤ " ابن مبارک نے فوراً وہ خطبہ از اوّل تا آخر سنا دیا[5]"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴ [3] ایضاً ص ۲۵۵ [4] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۶ [5] ایضاً ص ۱۶۵، ۱۶۶

احتیاط | اس علم و فضل اور قوتِ حافظہ کے باوجود وہ محتاط اس قدر تھے کہ محض حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ کسی نے اُن سے پوچھا "ابو عبدالرحمٰن! آپ احادیث یاد کرتے ہیں؟" یہ سنتے ہی رنگ بدل گیا۔ اور فرمایا "میں نے کبھی کوئی حدیث یاد نہیں کی ہے۔ میں کتاب اُٹھاتا ہوں اور اُس میں غور و خوض کرتا ہوں، پھر جو روایت مجھ کو پسند ہوتی ہے وہ خود بخود دل میں بیٹھ جاتی ہے"[1] امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ابن مبارک صاحبِ حدیث اور حافظِ حدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے"[2] ابن معین کا بیان ہے کہ "وہ ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے ان کی کتاب میں جو احادیث درج تھیں اُن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔

ابن مبارک نے اپنی کتاب میں منتخب احادیث کا اس قدر وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا کہ جو روایت اس میں نہیں ملتی تھی لوگ اُس سے مایوس ہو جاتے تھے[3]۔

حدیث سے شغف | حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے "ایک مرتبہ سردی کی رات میں ابنِ مبارک (غالباً عشاء کی نماز پڑھ کر) مسجد سے نکل رہے تھے کہ دروازہ پر مجھ سے ملاقات ہوئی اور ایک حدیث پر گفتگو ہونے لگی، اس گفتگو کو اتنی طوالت ہوئی کہ فجر کی نماز کا وقت آگیا اور موذن نے اذان دینی شروع کر دی"[4]

اسی شغف بالحدیث کی وجہ سے وہ باہر کم نکلتے تھے۔ زیادہ تر گھر میں ہی بیٹھے ہوئے احادیث و آثار کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا "آپ کو مکان میں تنہا بیٹھے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟" فرمایا "بھلا وحشت مجھ کو کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ہوتا ہوں"[5]

نا اہلوں سے اجتناب | نا اہل لوگوں کے سامنے حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴

[4] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۵ [5] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴ -

ایک ہاشمی شخص حضرت ابنِ مبارک کے پاس آیا اور روایتِ حدیث کی درخواست کی آپ نے انکار کر دیا ہاشمی نے اپنے ملازم سے کہا "چلو" اور سواری پر بیٹھ کر جانے لگا ابنِ مبارک نے فوراً اُٹھ کر رکاب تھام لی۔ ہاشمی بولا "ابنِ مبارک! آپ حدیث تو سُناتے نہیں اور یوں میری رکاب تھام رہے ہیں" فرمایا "میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے اپنے بدن کو ذلیل کر دوں لیکن حدیث تمہاری خاطر ذلیل کرنا نہیں چاہتا[1]"

اسناد کا اہتمام روایت کے معاملہ میں اسناد کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مسیب بن واضح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے ابنِ مبارک سے دریافت کیا کہ ہم کس سے علم حاصل کریں؟ فرمایا ان لوگوں سے جنہوں نے علم محض اللہ کے لیے طلب کیا ہو اور اسناد کے معاملہ میں سخت ہوں۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ملاقات کسی ثقہ شخص سے ہوتی ہے۔ لیکن اُس کی ملاقات غیر ثقہ سے ہوتی ہے اور وہ اُس سے روایت کر بیٹھتا ہے اور کبھی اُس کے برعکس ہوتا ہے۔ روایت کو چاہئے کہ ثقہ عن ثقہ مروی ہو[2]"

فقہ فقہ میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی۔ امام نووی، ابن عماد حنبلی سب اُن کو فقیہ لکھتے ہیں۔ امام مالک فرماتے تھے "یہ ابن مبارک خراسان کے فقیہ ہیں[3]" ابن شماس کہتے تھے "میں نے سب سے بڑے فقیہ کو دیکھا ہے اور سب سے بڑے متقی کو بھی، اور سب سے زیادہ قوی حافظہ رکھنے والے کو بھی۔ سب سے بڑے فقیہ ابن مبارک ہیں"۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی موجودگی میں بڑے بڑے معتمد علماء و فقہاء مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت سفیان ثوری سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے دریافت کیا "تم کہاں سے آئے ہو؟" بولا "میں اہل مشرق میں سے ہوں" آپ نے فرمایا "کیا تمہارے پاس مشرق کا سب سے بڑا عالم نہیں ہے؟" اُس شخص نے کہا "وہ کون ہیں؟" بولے عبداللہ بن مبارک" یہ سُن کر سائل نے تعجب

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۷

سے کہا "تو کیا ابن مبارک مشرق کے سب سے بڑے عالم ہیں"[۱]

جامعیت | ابن مبارک علمی و عملی کمالات کے ایک ایسے گلدستۂ سدا بہار تھے کہ اُن کی جس کسی خصلت کو دیکھا جاتا نگاہِ تجسس محوِ حیرت ہو کر رہ جاتی تھی اور بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکل جاتا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اربابِ درس و تدریس اور اصحابِ علم و فضل ہوتے ہیں "بادۂ مردافگن جنگ" کے حریف بننے کی تاب اُن میں کم ہوتی ہے۔ اور جو لوگ کتاب بینی میں زیادہ وقت گذارتے ہیں اُن کے گھوڑے میدانِ غزا میں سرپٹ نہیں دوڑتے لیکن ابن مبارکؒ کی ذات بیک وقت تمام علمی و عملی کمالات کی جامع تھی۔ عباس بن مصعب کہتے ہیں "ابن مبارکؒ حدیث، فقہ، ایام رجال، بہادری، سخاوت، تجارت، ہر دلعزیزی ان تمام کے جامع تھے"[۲] حسن بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ عبد اللہ بن مبارک کے اصحاب جمع ہوئے اور اُنھوں نے کہا کہ آؤ ابن مبارک کے خصائل و شمائل کو شمار کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے بالاتفاق کہا "ابنِ مبارک کی ذات ستودہ صفات میں علم، فقہ، ادب نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، خموشی، قیامِ لیل، عبادت، حج، غزوہ، شہسواری شجاعت، تندرستی و تنومندی، فضول اور لغو باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات جمع تھیں"[۳] حافظ ذہبی بڑے پُر اشتیاق انداز میں لکھتے ہیں "خدا کی قسم! میں عبد اللہ بن مبارک سے محبت فی اللہ کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اُن کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھلائیاں عطا فرمائیگا کیونکہ اللہ نے اُن کو پرہیزگاری، عبادت، اخلاص، جہاد، وسعت علم، پختہ یقینی، ہمدردی، غمگساری، مروت اور دوسری صفاتِ حمیدہ سے متصف کیا ہے"[۴]

---

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۲ [۲] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۵ [۳] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۱

اُن کی اس شانِ جامعیت کے باعث ابواسحاق الفزاری انہیں امام المسلمین کہتے تھے [۱]

مرجوعِ خلائق | حضرت عبداللہ بن مبارک کے فضل وکمال کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی، لوگ اُن کی زیارت وملاقات کے لیے بے چینی کے ساتھ کسی مناسب موقع کے منتظر رہتے تھے عبدالرحمٰن بن یزید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام اوزاعی نے اُن سے پوچھا "تم نے کبھی عبداللہ بن مبارک کو بھی دیکھا ہے؟" اُنہوں نے کہا "نہیں" فرمایا

لورأیتہ، لقرّت عینك [۲] — اگر تم انہیں دیکھ لیتے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں

وہ جدھر جاتے تھے ارادتمندوں اور عقیدت گساروں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں فروکش تھا کہ اسی اثناء میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے یہاں تشریف لانے کی خبر پہنچی۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بے تحاشا دوڑ پڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں ہزاروں آدمی استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل پڑے تھے، فضا پر غبار چھا گیا تھا۔ ہارون الرشید کی ایک حرم (اُم ولد) نے محل کے برج پر سے جو یہ تماشا دیکھا تو پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟" حاضرین نے کہا "خراسان کے ایک عالم جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے رقہ آرہے ہیں" بولی "بخدا! بادشاہ تو یہ ہیں، بھلا ہارون کیا بادشاہ ہے جو پولیس اور سپاہیوں کے بغیر لوگوں کو جمع کرہی نہیں سکتا" [۳]

جب حضرت عبداللہ بن مبارک مرو سے روانہ ہوئے تو اہلِ مرو کو آپ کی جدائی کا سخت رنج وقلق ہوا۔ ایک شاعر نے اُن لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا

اذا سار عَبْدُ اللهِ من مرو لیلۃً ۔۔۔ فقد سار منها نورها وجمالها

اذا ذكر الاحبار فی كُلِّ بلدۃٍ ۔۔۔ فهم انجمٌ فیها وانت هلالها

---

[۱] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۳ [۲] ایضاً ص ۱۵۷ [۳] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸۔

ترجمہ:۔ عبداللہ رات کے وقت مرو سے روانہ ہوئے تو گویا مرو کا تمام نور اور جمال وہاں سے چلا گیا۔ ہر شہر کے بڑے بڑے علماء کا اگر ذکر کیا جائے تو وہ سب ستارے ہوں گے اور اے ابنِ مبارک آپ اُن میں ہلال کی طرح چمکتے ہوں گے[۱]

علماء میں وقعت | عامۃ الناس کا کیا ذکر؟ بڑے بڑے ائمہ اور اساتذہ حدیث وفقہ اُن کا غایت درجہ احترام کرتے تھے اور اُن کے استقبال و مشایعت کو اپنا فریضۂ عقیدتمندی سمجھتے تھے۔ عبداللہ بن سنان کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک مکّہ سے روانہ ہوئے تو سفیان بن عیینہ اور فضیل بن عیاض اُن کی مشایعت کے لئے دور تک ساتھ گئے۔ اُن میں سے ایک نے ابنِ مبارک کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ فقیہ اہلِ مشرق ہیں" دوسرے نے کہا "اور فقیہ اہلِ مغرب بھی"[۲]

یحییٰ بن یحییٰ الاندلسی کہتے ہیں "ایک مرتبہ ہم امام مالک کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابنِ مبارک آگئے۔ اُنہوں نے شرکتِ مجلس کی اجازت چاہی، امام مالک نے اجازت دے دی۔ وہ تشریف لائے تو امام مالک نے اپنی نشست کو بدل دیا اور حضرت ابنِ مبارک کو اپنے پاس بٹھایا" یحییٰ کا بیان ہے کہ "امام مالک کسی شخص کے لیے بھی اپنی مجلس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے تھے"[۳]

حسن ادب | ابن مبارک حسن ادب کے جوہر سے بھی حصّہ وافر رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے اگر کوئی قرأتِ حدیث کرتا تھا تو وہ اُس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ سُنتے رہتے تھے۔ ابن مہدی کا بیان ہے "ابن مبارک أدَبُ عندنا من الثوری"[۴] ایک دفعہ امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے، جس میں ابن مبارک بھی اتفاقاً شریک ہو گئے تھے۔ ایک تلمیذ قرأت کر رہا تھا، اس درس میں متعدد مواقع پر امام مالک نے حضرت ابنِ مبارک سے بعض حدیثوں

[۱] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۲ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶ [۳] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [۴] تذکرۃ الحفاظ ۱ ص ۲۵۵

اور مسائل کی نسبت دریافت کیا کہ اُن کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں وہ از راہِ حسنِ ادب چپکے چپکے جوابات دیتے رہے امام مالک کو حضرتِ ابنِ مبارک کے اس ادب پر بڑا تعجب ہوا اور جب وہ چلے گئے تو فرمایا "یہ ابن مبارک فقیہ خراسان تھے"[1]

عبادت | ان علمی و اخلاقی کمالات کے ساتھ عبادت گذار بھی بہت تھے۔ نعیم بن حماد کہتے ہیں "میں نے ابنِ مبارک سے زیادہ نہ تو کوئی عقلمند دیکھا ہے۔ اور نہ اُن سے زیادہ کوئی عبادت گذار دیکھا"[2]۔

خوفِ خدا | اُن پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا کہ زہد سے متعلق احادیث یا آیات پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذبح کیے ہوئے بیل ہیں گھگی بندھ جاتی تھی اور وہ بولنے پر بالکل قادر نہیں ہوتے تھے[3]۔

فصاحت | فصاحت کا کمال بھی اُن میں اس قدر تھا کہ تمام علمارِ عصر اس کا اعتراف کرتے تھے ابن جریج تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "میں نے ابن مبارک سے بڑا کوئی عراقی فصیح نہیں دیکھا"

شاعری | اپنے علمی و مذہبی مشاغل کے ساتھ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن اُن میں عام شاعری سے الگ حکمت و نصیحت کی باتیں بیان کرتے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام یہ ہے

قد یفتح المرءُ حانوتاً لمتجرہٖ   وقد فتحتَ لک الحانوتَ بالدین

بین الاساطینِ حانوتٌ بلا غلقٍ   تبتاع بالدین اموال المساکین

صیّرت دینک شاہینًا تصید بہٖ   ولیس یفلح اصحاب الشواہین

ترجمہ:۔ (۱) لوگ تجارت کے لیے دکانیں کھولتے ہیں۔ لیکن تو نے دین کی دکان کھول رکھی ہے

(۲) بڑے بڑے ستونوں کے درمیان تیری دکان ہے جو بند ہی نہیں ہوتی اور جس کے ذریعہ دین کے بدلے میں مسکینوں کے اموال خریدے جاتے ہیں۔

(۳) تو نے (اے دین فروش) اپنے دین کو شاہیں بنا رکھا ہے جس سے تو شکار کرتا پھرتا ہے اور ہاں شاہیں باز لوگوں کو فلاح نہیں ہوتی۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸۔

تجارت | غایت خودداری کی وجہ سے وہ علم و زہد کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا نہایت معیوب خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر اُن کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اور اُس میں اُن کو جو نفع ہوتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فضیل بن عیاض کی روایت کے مطابق وہ ایک لاکھ درہم سالانہ فقراء پر تقسیم کرتے تھے[۱]۔

تجارت کا مقصد | لیکن اُن کی تجارت کا مقصد سرمایہ دار بن کر اپنے لیے بیش از بیش سامان آسائش فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ علم کی حقیقی وقعت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ صاحب علم کو اپنی کسی معاشی ضرورت میں ابنائے روزگار میں سے کسی کی طرف احتیاج نہ ہو جیسا کہ کسی فارسی شاعر نے کہا ہے۔

مرا بتجربہ معلوم گشت آخر حال | کہ قدر مرد بعلم ست و قدر علم بمال

اور ایک عربی شاعر کہتا ہے۔[۲]

وان کان اسری من رجال واحوط | ویزری بعقل المرء قلۃ مالہ

چنانچہ ایک دفعہ فضیل نے اُن سے دریافت کیا کہ "آپ ہم کو تو زہد اور قوت لایموت پر قانع رہنے کا حکم کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے قیمتی قیمتی سامان تجارت لاتے ہیں اور اسے بلدہ حرام میں فروخت کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟" فرمایا "اے ابو علی یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ مال کے ذریعہ اپنی آبرو محفوظ رکھوں اور اُس کی مدد سے خدا کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور تاکہ میں خدا کا جو حق اپنے ذمہ واجب دیکھوں اُس کی طرف سبقت کرکے اُسے ادا کر سکوں"۔ فضیل نے کہا "ابن مبارک! سبحان اللہ اس مقصد نیک کا کیا کہنا۔ اگر یہ پورا ہو سکے"[۳]۔ غالباً اسی عام مسلمانوں کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی وجہ سے ابن مہدی کہا کرتے تھے "میں نے اس اُمت کا خیر خواہ ابن مبارک سے زیادہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا"[۴]۔

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [۲] ترجمہ:- کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا سردار اور تدبیر کرنے والا ہو۔ لیکن اگر وہ قلیل المال ہے تو لوگ بات بات پر اُس کی عقل کو بٹہ لگاتے ہیں۔ [۳] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰ [۴] ایضاً ص ۱۶۰

علماء وطلباء کی خدمت

حضرت ابنِ مبارک یوں تو اپنا تمام مال کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے لیکن علماء وطلباءِ دین کی مالی خدمت کا خصوصیت سے بڑا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن الحسن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض سے جو اُن کے تلمیذ تھے فرمایا "اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا[1]"

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ ابن مبارک خاص اپنے اہلِ وطن پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا کہ وہ دوسرے شہروں میں تقسیم کر آتے ہیں۔ ابنِ مبارک کو اس اعتراض کی خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا "میں جن علماء اور طلباء پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے اربابِ فضل وصدق ہیں۔ اِن لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا، اور اس میں پوری محنت وسعی سے کام لیا، لیکن ان کی ضرورتیں بھی وہی ہیں جو عام لوگوں کی ہوتی ہیں اس لیے اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائینگے اور علم ضائع ہو جائیگا۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے ان کو غنی کر دیا تو یہ محمدؐ کی اُمت میں علم کی اشاعت کرینگے اور نبوت کے بعد میرے نزدیک اشاعتِ علم سے افضل کوئی چیز نہیں ہے[2]"

اربابِ حوائج کی امداد

علماء وطلباء کے علاوہ عام حاجتمند لوگوں کی امداد بھی بڑی فراخ حوصلگی سے کرتے تھے۔ سلمۃ بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مبارک کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں مقروض ہوں۔ آپ میری طرف سے قرض ادا کر دیجئے۔ آپ نے فوراً اپنے وکیل کو لکھ دیا کہ اس شخص کا قرض ادا کر دیا جائے۔ یہ شخص خط لے کر وکیل کے پاس آیا تو اُس نے پوچھا "تم نے عبداللہ بن مبارک سے کتنی رقم طلب کی تھی؟ بولا "سات سو درہم" اب اس وکیل نے حضرت ابنِ مبارک کو لکھا کہ "یہ شخص تو سات سو درہم کا مقروض ہے اور اسی کا آپ سے اُس نے مطالبہ کیا تھا

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [2] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰

لیکن آپ لکھتے ہیں کہ اس کو سات ہزار درہم دے دیے جائیں، اور اب تو غلات بھی ختم ہو گئے ہیں" ابن مبارک نے جواب میں لکھا " اگر غلات ختم ہو گئے ہیں تو کیا مضائقہ ہے، عمر بھی ایک دن یونہی ختم ہو جائیگی، اب تو جو کچھ میرے قلم سے نکل گیا ہے تم اس پر عمل کرو"[1]

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ محمد بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک طرطوس آتے جاتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے تھے۔ یہاں ایک نوجوان تھا جو سرائے میں قیام کی مدت میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت کرتا، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا، اور ان سے حدیث کا سماع کرتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ ابن مبارک رقہ کی سرائے میں حسب معمول قیام پذیر ہوئے تو آپ کو وہ نوجوان نہیں ملا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ قرض کی وجہ سے گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا " وہ کتنی رقم کا مقروض ہے؟" لوگوں نے بتایا دس ہزار درہم کا۔ آپ نے تلاش کے بعد صاحبِ قرض کو رات کو بلایا اور کہا کہ تم اپنے دس ہزار درہم مجھ سے لو اور اس نوجوان کو رہا کر دو۔ یہ خطیر رقم ادا کرنے کے بعد حضرت ابنِ مبارک شب میں ہی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ نوجوان رہا ہوا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ حضرت ابن مبارک اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، اور اب تک وہ غالباً دو تین منزل پہونچ ہو گئے۔ یہ سُن کر نوجوان بھاگا اور آخر کار دو تین منزل کی مسافت پر اُنہیں پالیا۔ حضرت ابن مبارک نے اُس نوجوان سے اس کا حال دریافت کیا تو اُس نے کہا۔ میں قید میں تھا کہ ایک شخص سرائے میں مقیم ہوا اُس نے میری طرف سے قرض ادا کر دیا اور میں رہا ہو گیا، اور لطف یہ ہے کہ میں اُس شخص کو جانتا بھی نہیں ہوں کہ کون ہے، اور کہاں سے آیا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی وفات تک کسی پر اس راز کا افشا نہیں ہوا[2]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۰ ص ۱۵۹! [2] ایضاً